بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

گذشتہ دو ماہ کے "اشارات" میں ہم نے حکمراں طاقت کو اُن ذمہ داریوں اور مطلوبہ تغیرات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تقاضا نیا دستور کر رہا ہے۔ اس مرتبہ ہم اپنا روئے سخن پاکستان کے عوام اور شہریوں کی طرف پھیرتے ہیں۔

دستور کا خیر مقدم جس جذبہ و جوش کے ساتھ عوام نے کیا ہے اور "یوم جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کی تقریب جس دلی ذوق و شوق سے منائی ہے، اس کا انہیں فی الواقع حق پہنچتا تھا۔ "یوم آزادی" کی سرکاری تقریب کے مقابلے میں یہ تقریب صحیح معنوں میں عوامی تھی اور اسی وجہ سے اس کا معیار اور پیمانہ زیادہ اونچا رہا۔ پاکستان کی ایک ایک مسجد میں اسلام اور پاکستان اور ملت کی سربلندی کے لیے دعائیں مانگی گئیں، دستور کے موضوع پر جامع مساجد میں خطبات دیئے گئے، جلسوں میں اسلامی نظام پر تقریریں کی گئیں، شکرانہ کے نوافل پڑھے گئے غریبوں کو کھانے کھلائے گئے اور مختلف اسالیب سے لوگوں نے اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا۔

یہ فی الواقع ایک حقیقی مسرت کا موقع تھا۔ ہماری سیاسی و قومی تاریخ میں ایک بڑا دن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا تھا اور اب دوسرا بڑا دن ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کا دن قرار پایا ہے۔ اُس دن ہمارے جغرافیے میں ایک تبدیلی واقع ہوئی تھی اور اِس دن سے ہماری تاریخ میں تغیر آ رہا ہے۔ اُس دن زمین کی لوح پر نئی لکیریں کھینچی گئی تھیں اور اِس دن ہماری زندگی کے نامۂ تقدیر پر نئے نقوش نمودار ہو رہے ہیں۔ اُس دن ملی زندگی کا محض نیا قالب کھڑا کیا گیا تھا، اور اِس دن اُس قالب میں اصول و مقصد کی رُوح پھونکی جا رہی ہے۔

نئے دستور میں اگرچہ خوبیاں ہی خوبیاں نہیں، قابلِ اصلاح خرابیاں بھی موجود ہیں، لیکن جن وجوہ سے

اس کا خیر مقدم پوری گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

— آزاد ہونے کے باوجود آٹھ برس کی لمبی مدت تک ہمارا اپنا کوئی دستور نہ تھا اور ہم ایک غیر قوم کے متروکہ دستور کے تحت لشتم پشتم کام چلا رہے تھے۔ زندگی کے لیے کوئی نظریہ نہ تھا، عمل کے لیے نصب العین کی کوئی منزل نہ تھی، منزل تک لے جانے والا راستہ معین نہ تھا، تعمیر کا کوئی نقشہ طے نہ تھا، گویا ہم اندھیرے میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ اب ہمارے ہاتھوں میں اپنا بنایا ہوا ایک دستور ہے، اس دستور میں ایک ملی نصب العین طے کر دیا گیا، اس نصب العین کے اصولی تقاضے متعین کر دئے گئے ہیں اور بہ حیثیت ایک مسلم ملت کے ہم نے مطلوبہ تبدیلیوں کو اس دستوری نقشے میں سامنے رکھ لیا ہے۔ اب ہم خدا خدا کر کے دنیا کی آزاد اقوام سے آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

— ہماری آزادی اور ہماری حاکمیت ۲۲ مارچ ۵۶ء کے نیم شب تک ملکہ برطانیہ کی نمائندگی کرنے والے "فرد واحد" کے پاس رہن تھی اور اب ۲۳ مارچ سے اس کا فک رہن عمل میں آیا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے رو سے سرے سے ہمارا کوئی شہری حق نہ تھا، اب پہلی مرتبہ ہم دستوری حیثیت سے کچھ نہ کچھ شہری حقوق کے مالک ہوئے ہیں، اور ایک آزاد ریاست کے شہریوں کے مرتبے کو پہنچے ہیں۔

— گومگو کا ہشت سالہ دور جس میں ایسے مواقع پیدا ہوئے کہ آمریت اپنے ڈراؤنے چہرے کے ساتھ قومی زندگی کے دروازے سے آکر جھانکتی رہی، اس دستور کے نفاذ کے ساتھ ختم ہو گیا۔

— سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دستور میں خدا کی حاکمیت کے اقرار کے ساتھ یہ بنیادی اصول مان لیا گیا کہ قانون سازی کا اساسی سرچشمہ اور معیارِ فیصلہ کتاب و سنت کی شریعت ہو گی۔ یہ اسلامی رجحان کی ایک کھلی کھلی فتح ہے الحاد پسند مغرب زدہ عناصر پر۔ باوجودیکہ اس اصول کو عمل میں لانے کے لیے جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ حد درجہ ناقص اور ڈھیلا ڈھالا ہے، تاہم ایک مسلمان قوم کے اندر اس اصول کے طے پا جانے کے بعد کسی طاقت کی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف قانون سازی کرتی چلی جائے۔

یہ چند ایسے کھلے کھلے وجوہ ہیں جنھوں نے ۲۳ مارچ کی تقریب پر عوام کے دلوں میں ایک نئی روح دوڑا دی ہے

دستور ـــ اور بڑی حد تک جمہوری و اسلامی دستور ـــ حاصل کر لینے کے اس عظیم الشان واقعہ میں چند قیمتی سبق پوشیدہ ہیں، عوام کو چاہیے کہ ان قیمتی اسباق کو اخذ کریں۔

پہلا سبق یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے عام لوگ ایک مطالبۂ حق پر جم جائیں اور کسی حال میں اسے چھوڑنے اور بھلا دینے پر تیار نہ ہوں تو کسی ٹال مٹول، کسی سازش اور کسی تشدد سے ان کا راستہ نہیں روکا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی طاقت اور سرکش سے سرکش قیادت کو ایک نہ ایک دن اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ سیاست کے دائرے میں کوئی مقصد بغیر اس کے حاصل نہیں ہوتا کہ مختلف جماعتیں اور عناصر اور عام لوگ چھوٹے چھوٹے اختلافات اور نزاعات کو بالائے طاق رکھ کر آپس میں متحد ہوں، مل جل کر جدوجہد کریں اور منظم طریقے سے اپنا مطالبہ سامنے لائیں۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ پُرامن آئینی جدوجہد سے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو خلافِ قانون تخریبی طریقوں اور غیر اخلاقی ہنگامہ آرائیوں اور اندھے جوش کے طوفانوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی تاریخ میں شورش انگیزی اور ہڑبونگ کے ذریعے سے آج تک جو نتائج پیدا کیے جا سکے ہیں ان سب کے مقابلے میں آٹھ برس کی پُرامن اور منظم دستوری جدوجہد کا حاصل زیادہ گراں بہا ہے۔ اس گراں بہا حاصل کے لیے اگرچہ لوگوں نے نیندیں حرام کیں، مال صرف کیے، تار دیے، محضرنامے بھیجے، جلسوں میں قراردادیں پاس کیں، لیکن کہیں ایک مرتبہ بھی قانون شکنی نہیں کی گئی، نہ کسی ایک موقع پر عوام بے قابو ہوئے، چنانچہ کوئی ایک قطرۂ خون بھی نہیں گرنے پایا۔ محض نظم اور اخلاق اور دلیل کی قوت سے چار جانب سے حملہ کرنے والی سخت مخالف طاقتوں کا زور توڑ دیا گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ تاروں اور محضرناموں سے کیا ہوتا ہے، لیکن جمہوری لحاظ سے اچھے حالات نہ ہونے کے باوجود جمہوری و آئینی طریق کار کی اس فتح سے ملک کے تعمیر پسند عناصر کے ہاتھ مضبوط ہو گئے ہیں، اور شورش پسند طاقتوں کا وزن کم ہو گیا ہے۔

ان اسباق کو گرہ میں باندھ کر ادائے فرض کے باقی ماندہ مراحل کو بھی اتحاد، استقلال، تنظیم اور آئین پسندانہ طریق کار سے طے کرنے کا اہتمام کیجیے اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آئندہ آپ کو کس مزاج کے لیڈروں اور کس طرز کی جماعتوں کے ساتھ لگ کر چلنا ہے۔

عوام سے کہنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یومِ جمہوریۂ اسلامیہ کا جشن منا لینے پر کام ختم نہیں ہو گیا کہ اب آپ بستر جما کر دراز ہو جائیں اور کمریں کھول کر چین کی نیند سو جائیں بلکہ اصل کام کا آغاز ۲۳ مارچ سے ہو رہا ہے۔ اب تک تو سارا جھگڑا قومی زندگی کے نقشۂ تعمیر پر تھا۔ نقشۂ تعمیر کے طے پا جانے بغیر ایک اینٹ بھی نہیں رکھی جا سکتی رکھی جائے تو محنت کا صرفِ بے جا ہو گا۔ اب نقشۂ تعمیر کے طے پا جانے پر عملاً عمارت کو اٹھانے کا کام شروع ہو رہا ہے۔ آٹھ برس سے زندگی کے مستقبل کی عمارت کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ آیا اسے ایک میکدہ ہونا چاہیے، صنم خانہ ہونا چاہیے، کلب ہاؤس ہونا چاہیے یا ایک دارالاسلام ہونا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لمبی بحث ان لوگوں کے حق میں فیصل ہو گئی ہے جو پاکستان کو کتاب و سنت کے اصولوں کے مطابق اسلام کا گھر بنانا چاہتے تھے۔ اب ایک متعین نقشہ سامنے ہے، لیکن یہ نقشہ از خود عمارت میں نہیں بدل جائے گا، اس کے رہنما اصول کوئی جادو کا کرشمہ نہیں دکھائیں گے، اس کی دفعات اٹھ کر انجینیروں اور راج مزدوروں کا کام نہیں سرانجام دیں گی اور نہ اس کے الفاظ عمارت کے لیے مطلوبہ مسالہ بن سکتے ہیں۔ عمارت تو خود ہم ہی کو بنانی ہے، ہم میں سے انجینیر اور راج اور بڑھئی بھی اٹھیں گے، ہمیں کو مزدور بن کر اس کے لیے سالہا سال مشقت کرنی ہو گی، اور ہمیں کو اپنے بہترین افکار و جذبات اور اعمال و کردار کا مسالہ اس کے لیے فراہم کر کے دینا ہو گا۔ ایک ایک ردّہ اٹھاتے ہوئے ہم ہی اسے منڈیروں اور میناروں اور کنگروں تک لے جائیں گے، جب کہیں جا کر نیکی اور سلامتی کا ایک گھر تعمیر ہو گا جس کے سایے میں ہم اور ہماری آئندہ نسلیں سکھ پا سکیں۔ یہ ایک عالمِ نو کی تعمیر کا کام ہے اور یہ جبھی ہو گا کہ بچہ بچہ صدیاستے احساسِ فرض سے سرشار ہو کر اٹھ کھڑا ہو اور خون پسینہ ایک کر دینے کے لیے تیار ہو جائے ورنہ اگر ہم لوگ سو گئے تو جب بھی آنکھ کھلے گی بجز ایک کاغذ کے پرزے کے اور کچھ ہمارے سامنے نہ ہو گا۔

خوب سمجھ لیجیے کہ ہمارے دستور میں خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ وہ روشن رخ بھی رکھتا ہے اور تاریک پہلو بھی! اس کے روشن رُخ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مخلص طاقت برسرِ عمل ہو تو وہ پورے کا پورا اسلام قائم کر سکتی ہے اور یہ دستور اس کے ہاتھ نہیں باندھتا۔ اس کے تاریک پہلو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرار پسند طاقت کار فرما ہو تو وہ دستور کے تقاضوں سے انحراف کر سکتی ہے، ٹال مٹول سے کام لے سکتی ہے اور یہ دستور اس کو کسی تعمیر

صالح پر مجبور نہیں کرتا۔

ایسے دستور پر جو ریاست بنی ہو وہ غیر معمولی حد تک مضبوط رائے عام کی محتاج ہے۔ اس میں بھلے برے کا سارا دار و مدار عوام پر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مرکب دستور کو لے کر چلنے والی مملکت کے عوام کی ذمہ داریاں حسب ذیل ہیں:

اولاً، وہ حکومت کے تمام معاملات اور اس کے اندر ہونے والے تغیرات سے براہِ راست گہری دلچسپی لیں اور مسائل کا پورا پورا شعور حاصل کریں۔ وہ اپنے کارپردازوں اور نمائندوں پر کڑی نگاہ رکھیں اور تنقید و احتساب کے فرض سے غافل نہ ہوں۔ وہ ایسی ذہنی فضا تیار کر دیں کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی طاقت کو دستور کے اسلامی اور جمہوری تقاضوں سے انحراف کی جرأت نہ ہو سکے بلکہ اس ذہنی فضا کا دباؤ ان کو قرارداد مقاصد، رہنما اصول دستور کی صحیح روح اور اس کی دفعات کی احسن تعبیر پر کاربند ہونے کے لیے مجبور کر دے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ عوام اپنے آپ کو منظم طاقت بنائیں۔

ثانیاً، اس دستور کے روشن پہلوؤں کو غالب کرنے اور اس کے تاریک پہلوؤں کو ختم کرنے کے لیے جن ترامیم کی ضرورت ہے ان کے لیے ساری قوم اسی طرح سرگرم جدوجہد کرے، جس طرح اب تک دستور بنوانے کے لیے کی گئی ہے۔ ورنہ ترمیم کے طریقے کی آسانی سے مخالفِ اسلام طاقتیں فائدہ اٹھا کر دستور کے روشن پہلوؤں کو اور کمزور بھی کر سکتی ہیں۔

ثالثاً آئندہ اس ملک میں ہونے والے انتخابات میں عوام کو بڑی فرض شناسانہ احتیاط سے اپنی رائے کا استعمال کرنا چاہیے۔ ان کی غفلت کی وجہ سے اگر خود ان کی آراء سے غلط قسم کے لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئیں اور وہ اس دستور کا ستیاناس کر کے رکھ دیں تو اس تباہی کی ذمہ داری خود قوم پر ہوگی اور حکمرانوں کے مقابلے میں عوام کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ ایمان و ضمیر کی زندگی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اندر سے ایسے لوگوں کو آگے لائیں جو دستور کے اسلامی و جمہوری تقاضوں کا شعور بھی رکھتے ہوں اور ایمان داری سے ان کو جامۂ عمل بھی پہنانا چاہتے ہوں، نیز جو اصلاح کر کے اسے ایک معیاری اسلامی دستور بنا دینے کی تڑپ بھی رکھتے ہوں تو پھر نہایت تیز رفتاری سے نظامِ اسلامی کی تعمیر ہو سکے گی اور ملت کے

صدیوں کے ارمان بر آسکیں گے۔

ان سہ گانہ ذمہ داریوں کو ہمارے ایک ایک مسلم شہری کو اس جذبہ و احساس سے اپنے سر لینا چاہیے کہ کہ جیسے تنہا وہی حیاتِ نو کا معمار ہے، وہی اسلام کا فداکار سپاہی ہے، وہی ملت کی فلاح و بہبود کا پاسبان ہے، وہی پاکستان کو ایک اصولی و مقصدی طاقت بنانے کا ضامن ہے۔ ورنہ اگر عام لوگ اپنی اپنی گھٹیا خواہشوں میں مگن رہیں اور اپنے اپنے انفرادی و نجی مقاصد کے درپے رہیں تو پھر آسمان سے فرشتے تو آکر ان کے حصے کے فرائض کو ادا نہیں کر جائیں گے

یہ بات بھی عوام کے ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ صرف حکمران طاقت سے مطالبے کرتے رہنے سے زندگی کی تعمیر نہیں ہو جاتی بلکہ کچھ مطالبے اپنے آپ سے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ محض یہ خواہش کرنا کہ حکومت ہمیں مسلمان بنا دے اور قانون کے زور سے ہماری اصلاح کر دے کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا، تاوقتیکہ آپ خود بھی اپنے آپ کو اپنے اندرونی جذبے سے رضاکارانہ طور پر اسلام کے تابع کر دینے پر متوجہ نہ ہوں۔ قانون کی طاقت صرف اس حد تک کارگر ہوتی ہے کہ کسی اصول و نظام پر برضا و رغبت چلنے والے معاشرے میں افراد کی جو تھوڑی سی تعداد انحراف، بغاوت اور سرکشی دکھاتی ہے اسے بزور سیدھے راستے پر ڈال دیا جائے لیکن اگر عوام بہ حیثیت مجموعی انحراف پسند ہوں تو بہتر سے بہتر قانون بھی بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم دس پانچ فیصدی شہری تو ہمارے اندر ایسے ہونے چاہئیں کہ جو محض اپنے ایمان کے زیر اثر برضا و رغبت ہر اس مطالبے کو پورا کریں جو اسلام نے ان سے کیا ہے اور ہر اس چیز سے اجتناب کریں جس سے اسلام نے روکا ہے۔ ایسا عنصر نظامِ اسلامی کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے اور یہ آگے لگ کر اوسط درجے کے شریف لوگوں کو ساتھ لے چلتا ہے۔ پھر قانون کا دباؤ بہت بڑی اکثریت کے لیے کارگر ہو جاتا ہے اور جو تھوڑے سے لوگ سرکشی کرنے والے رہ جاتے ہیں ان کو تعزیر و تہدید کے آخری چارہ کار سے رو بہ اصلاح لایا جا سکتا ہے۔

ایسے ہی فرض شناس شہریوں سے بنا ہوا معاشرہ تھا جس کے بل پر مدینہ کی معیاری اسلامی ریاست

چلی اور ایسی شان سے چلی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ برسبیل تذکرہ اُن مقدس شہریوں کی قائم کردہ چند مثالیں ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

عرب کے جاہلی ماحول میں معاشقوں اور بدکاریوں کا دور دورہ تھا۔ دائرہ اسلام میں آنے والے بہت سے لوگ فسق و فجور کے ان طوفانوں میں سے غوطے کھا کھا کر نکلے تھے۔ لیکن مسلمان ہو کر جب انھوں نے ایک بار یہ تسلیم کرلیا کہ خدا ورسول نے بدکاری کو حرام ٹھہرایا ہے تو اس کے بعد پھر کبھی ان حضرات کے قلب و نظر کا دامن تر نہ ہوا۔ حضرت مرثد ہجرت کے بعد مکہ میں رہ جانے والے کمزور مسلمانوں کو نکالنے کے کام پر مامور کئے گئے تھے اور یہ خفیہ طور پر مکہ پہنچے وہاں عناق نامی ایک طوائف تھی جس سے جاہلیت میں ان کا رابطہ رہ چکا تھا، وہ رات کو کہیں نکلی اور حضرت مرثد کو پہچان لیا۔ دعوت دی کہ رات میرے ہاں گذاریے، لیکن انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ دور گیا، اب تو زنا حرام ہو چکی!

ایک خاتون جو زمانۂ کفر میں اچھا کردار نہ رکھتی تھیں، ان کو ایک شخص نے ترغیب گناہ دلائی اور اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ ان خاتون نے جواب دیا "ہٹو! اب وہ دن گئے، اب اسلام آگیا ہے"!

حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کسی موقع پر فرمایا "مجھے یہ پسند ہے کہ میری ناک مردار کی بدبو سے بھر جائے، لیکن یہ گوارا نہیں کہ اس میں کسی اجنبی عورت کی خوشبو پہنچے"۔

شراب کا عرب میں اتنا رواج تھا کہ گلی گلی میکدے کھلے تھے اور گھر گھر بھٹیاں لگی تھیں۔ یہ گویا عربی کلچر کا ایک اہم جز تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ شراب نوشی کے عادی تھے اور اسی حالت میں اسلام لے آئے۔ اسلام میں جب تک صریح ممانعت وارد نہیں ہوئی، شراب کے دور مسلمانوں میں بھی چلتے رہے۔ بس چند اونچے مرتبے کی ہستیاں تھیں جن کے اسلامی ذوق و مزاج نے حرمت کے حکم سے قبل ۔ بلکہ اسلام لاتے ہی بنت عنب کو طلاق دے دی تھی۔ کچھ ایسے صحابہ بھی تھے جنھوں نے شراب نوشی پر قرآن کی ابتدائی پابندیوں سے اشارہ پاکر ہی اس بلا سے نجات پالی تھی۔ مگر بہت سے لوگوں نے شغلِ نا و نوش کو جاری رکھا۔ آخر کار سورۂ مائدہ

میں شراب اور جوئے کی حرمت کا حکم نازل ہوا جس کا اختتام اس سوال پر تھا کہ "فھل انتم منتھون" ؟ تو کیا اب تم باز آجاؤ گے ؟

حضرت عمرؓ نے یہ دل ہلا دینے والا کلمہ سنتے ہی صدا بلند کی " انتھینا " ہم باز آئے ! حضرت انس بن مالک کا بیان ہے کہ میں ایک مجلس میں ابوعبیدہ ، ابوطلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ اسی حالت میں ایک شخص نے آکر خبر دی کہ " شراب حرام کر دی گئی "! ابوطلحہ نے یہ سنتے ہی کہا " انس ، اٹھو اور شراب کو زمین پر لنڈھا دو " اس اعلان پر مدینہ کی ہر بزم مے پر یہی کیفیت گذر گئی ۔

سودی لین دین عرب کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو تھا ، اور سود کی ممانعت سے نہ صرف یہ کہ بہت سے مہاجنوں کے کاروبار چوپٹ ہوتے تھے بلکہ کاروباری نظام پر بھی اس کا بھاری اثر پڑتا تھا اور عام لوگوں کے لیے حصولِ قرض میں دقتیں پیدا ہوتی تھیں ۔ مگر سود کی حرمت کا جب ایک بار قطعی حکم صادر ہوگیا تو اس کے مطابق جاہلیت کی تمام واجب الوصول رقوم سود قرض خواہوں نے ساقط کر دیں اور صرف اصلِ زر پر اکتفا کیا ۔ حدیہ کہ وہ معاملات جن میں سود کا شبہ بھی ہوتا تھا ، ان سے پورا پورا اجتناب کیا جانے لگا ۔ حضرت مالک بن اوس نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ کے ساتھ اشرفیوں کے عوض روپے کا تبادلہ کرنا چاہا ، حضرت طلحہ نے اشرفیاں اٹھالیں اور کہا کہ ابھی خزانچی آجائے تو روپے کی ادائیگی کر دی جائے گی ۔ حضرت عمرؓ پاس ہی سن رہے تھے ، مالکؓ سے کہنے لگے " دیکھو روپیہ لیے بغیر نہ اٹھنا ، رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ سونے کے بدلے میں چاندی اگر دست بدست نہ لی جائے تو سود ہے "۔

حضرت معمر بن عبداللہ نے اپنے غلام کی معرفت بازار سے ایک صاع گیہوں کے بدلے جو منگایا ، جو ایک صاع سے زیادہ نکلا ۔ انھوں نے فوراً جو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ غلہ کو غلہ کے عوض برابر سرابر لینا دینا چاہیے ۔ پس مجھے خوف ہے کہ یہ سود کے مشابہ نہ ہوجائے ۔

عرب کے جاہلی معاشرے میں عورتیں پردہ کے حدود سے ناآشنا تھیں اور کھلے بندوں پھرتیں بلکہ مخلوط

مجالس اور تقاریب میں دھڑلے سے شریک ہوتیں۔ اسلام میں آنے والی خواتین ذہنی انقلاب کے تحت از خود بے حیائی سے دور ہو کر عصمت مآبی کے مرتبے پر آگئی تھیں، لیکن پردہ کا قانون معاً نافذ نہیں ہوا بلکہ تدریجاً احکام دئے گئے۔ اس معاملے میں بالعموم جاہلی کلچر یہ تھا کہ عورتیں سر پر ایک خاص طرز کے کساوے باندھتیں اور جوڑے کی طرح اس کی گرہ نیچے چوٹی پر لگائی جاتی۔ گریبان کھلے رہتے اور گلے کے ساتھ سینے کا ایک حصہ نمایاں رہتا۔ چھاتیوں پر صرف قمیص ہوتی، اور کوئی انتظام نہ تھا۔ دو دو تین تین چوٹیاں پیچھے لہراتی رہتیں۔ سورۂ نور میں عورتوں کے لیے حکم آیا "اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں"۔ اس حکم کو سن کر برسوں کے بگڑے ہوئے ذوق اور کلچر کے باوجود مسلم معاشرے کی خواتین کے ماتھے پر بل نہ آئے، اس پر ردوکد نہیں کی گئی، اس پر یہ احتجاج نہیں کیا گیا کہ یہ تو عورتوں کی آزادی میں بے جا مداخلت ہے اور اس سے تہذیب کے دامن پر تنگ خیالی کا داغ لگ جائے گا، اس سے بچنے کے لیے چور دروازے نہیں تلاش کیے گئے، بلکہ مسلم خواتین نے پابندیٔ قانون کی ایک امٹ مثال قائم کر دی۔ لوگوں نے جونہی اپنے گھروں میں جا کر خدا کے اس قانون کا ذکر کیا تو عورتوں میں فوراً ایک سرگرمی پیدا ہو گئی، ایک ایک خاتون نے تعمیلِ حکم کے لیے جو کچھ انتظام ممکن تھا آناً فاناً کر لیا۔ کسی نے فوراً اپنا کمر پٹہ کھول کر سر و سینہ پر ڈال لیا، اور کسی نے چادر سے دوپٹہ بنا کر اسی وقت اوڑھ لیا۔ اس تعمیلِ حکم میں باریک دوپٹے بنا کر کسی نے دانستہ خیانت نہیں کی کہ حکم بھی پورا ہو جائے اور حسن و جمال نمایاں بھی رہے۔ ناسمجھی سے کسی نے باریک دوپٹہ لیا تو سرورِ عالم نے بالاختصاص اس کی اصلاح کر دی۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اگلی صبح کو جتنی عورتیں نماز کے لیے مسجد نبوی میں آئیں۔ تمام کی تمام دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں، بلکہ بعض خواتین نے تو اپنے آپ کو سیاہ چادروں سے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ حضرت عائشہؓ مزاحاً فرماتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ ان کے سروں کے آشیانے بن گئے ہیں۔ اور یہی چادریں دورِ مابعد میں تھوڑی سی خیاطی سے برقع کی صورت اختیار کر گئیں۔

اسلام کا جو ضابطۂ تجارت نافذ کیا گیا تھا اس کا ایک قاعدہ یہ تھا کہ شہری لوگ (خصوصاً دلال اور آڑھتی) قابلِ فروخت مال لانے والے دیہاتیوں [illegible] سودے نہ کیا کریں۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ دیہاتی لوگ منڈی کے

نرخ سے بے خبر ہونے کی وجہ سے نقصان نہ اٹھائیں اور بازار میں گاہکوں کی مانگ اور ان کی باہمی مسابقت کے زیرِ اثر طلب و رسد کا فطری قانون ان کو جو فائدہ پہنچا سکتا ہے اس سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدو اپنا مال بیچنے کے لیے حضرت طلحہ بن عبیداللہ سے ملا انھوں نے کہا کہ میں اس طرح تم سے مال نہیں خرید سکتا، تم بازار میں جاؤ، خریداروں کی تلاش کرو، میں جو مفید مشورہ دے سکتا ہوں، دوں گا۔

نبی اکرمؐ نے مسلمان مردوں کے لیے ریشمی لباس کو ممنوع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک مرتبہ بازار سے کپڑا خریدا۔ بعد میں دیکھا تو اس میں ریشمی دھاگہ بھی استعمال ہوا تھا، فوراً واپس کر دیا۔

اموالِ یتامیٰ کے بارے میں خدا کے قانون نے جس دن یہ انتباہ دیا کہ جو لوگ ظلم کر کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں تو معاً اسلامی ریاست کے شہریوں نے یتیموں کے اموال اپنے اموال سے بالکل الگ کر دئیے کہ مبادا غلط فہمی میں رزقِ حلال کے ساتھ حرام کی آمیزش ہو جائے۔

بے شمار درخشاں مثالوں میں سے یہ چند مثالیں ہم نے پیش کی ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کیسے لوگوں کے دم قدم سے قائم ہوتی ہے اور اسلامی نظام کے اصل معمار کس سیرت و کردار کے لوگ ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی اول روز سے اپنے پروگرام کے جس جزء کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر کام کر رہی ہے وہ یہی ہے کہ معاشرہ میں سے ایسے آدمی چھانٹ چھانٹ کر منظم کیے جائیں اور تعلیم و تربیت سے مزید تیار کیے جائیں جن کو کسی چیز پر کاربند کر دینے کے لیے بس یہ علم کافی ہو کہ فلاں بات کو خدا اور رسول نے چاہا ہے اور جن کو کسی چیز سے روک دینے کے لیے بجز اس اطلاع کے اور کسی طاقت کے استعمال کرنے کی ضرورت نہ پڑے کہ کتاب و سنت کے قانون میں یہ حرام اور ممنوع ہے۔ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی ہمارے خستہ حال معاشرے کے اندر سے ایسے افراد برابر نکلتے چلے آرہے ہیں اور مزید کوشش اگر جاری رہے تو یہ عنصر قوم کے اندر موثر ترین طاقت بن سکتا ہے۔ چاہیے یہ کہ نئے اسلامی دستور کا خیر مقدم ہمارے عوام کی زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد اس انقلابی جذبے سے کریں کہ اب ہم نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں۔ ہمارے اندر سے ایسے لوگ ابھرنے چاہئیں جو یوں

سوچیں کہ ہم ایک اسلامی ریاست کے شہری ہیں اس لیے کسی سے دھاندلی نہیں کر سکتے، ہم ایک اسلامی نظام کے ملازم ہیں لہٰذا رشوت نہیں لے سکتے، ہم ایک پاکیزہ تمدن کے معمار ہیں لہٰذا ناچ گانوں سے دلچسپی نہیں لے سکتے، ہم دنیا بھر کے سامنے حق کی گواہی دینے والے ہیں اس لیے گھٹیا اخلاق کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اب اپنی ریاست کے بارے میں قوم اپنے نقطۂ نظر کو یکسر بدل دے اور اس کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرے جیسا کہ اسلامی ریاست کا استحقاق ہے، حکمراں طاقت اور برسر اقتدار افراد سے چاہے کتنے بھی اختلافات ہوں اور ان کے کسی نظریے، ان کے کسی طرزِ عمل، ان کی کسی پالیسی سے کیسی ہی شدید بیزاری کیوں نہ ہو، اسلامی ریاست کے جو حقوق اپنے شہریوں پر آتے ہیں وہ کسی حال میں سلب نہیں ہوتے۔ آپ غلط کاموں اور غلط خیالوں کے خلاف احتجاج کرنے اور غلط افراد کو بدلنے کی ساری کوششوں کے ساتھ ساتھ ان حقوق کی ادائی میں فرق نہ لائیں جو اسلامی ریاست کی طرف سے عائد ہوتے ہیں اور جس کے لیے ہم میں سے ہر فرد کو خدا کے حضور کل جواب دہ بھی ہونا ہے۔

اب یہ ریاست صرف ہماری قوم کا وطن نہیں، بلکہ اسلام کا گھر ہے۔ اسلام کا گھر ہونے کی وجہ سے اب اس کا تقدس تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کے ایک ایک ذرۂ خاک کے محافظ ہوں اور اس پر کسی دشمن کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دیں۔ اب اس کا خزانہ، اس کا مال اور اس کے املاک خدا کی امانت ہیں اور ہم میں سے ہر مسلم شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مال کو اپنے نفس کی دستبرد سے بھی بچائے اور دوسروں کے دستِ خیانت سے بھی اس کی حفاظت کرے۔ اب اس ریاست کی کسی ڈیوٹی اور خدمت کو (جو کتاب وسنت کے قانون سے نہ ٹکراتی ہو) وفاداری اور انہماک سے سرانجام دینا ایک دینی و شرعی فریضہ ہے اور ایک عظیم ترین پیمانے کی اجتماعی نیکی میں حصہ داری کے ہم معنی ہے۔ اب اس کی خدمت کرنا محض پیٹ کی ضرورت نہیں، بلکہ ایمان کا تقاضا ہے۔ اب اس ریاست کے قوانین (معروف کی شرط کے ساتھ) کی اطاعت کرنا عین مذہب و تقویٰ کا معاملہ ہے۔ اب اس ریاست کی ہر معروف سرگرمی میں دل و جان سے تعاون

کرنا، اس کے ماحول کو ہر منکر سے پاک کرنے کی سعی کرنا، اور اس کے حکمراں جو قدم بھی اسلام کے رُخ پر اٹھائیں اس میں دل وجان سے ان کا ساتھ دینا ایک ایک مسلمان کا فرضِ منصبی قرار پاگیا ہے۔

عوام کو چاہیے کہ اب وہ اس نقطۂ نظر کے ساتھ اپنی ریاست سے معاملہ کریں۔

عامۃ الناس کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا اور ان پر انہیں کاربند کرنا دراصل معاشرے کے ذہین عناصر کا کام ہے۔ یہ فریضہ ہمارے سیاسی رہنماؤں، ہمارے ادیبوں اور شاعروں، ہمارے صحافیوں، اور مصنفوں اور ان سب سے بڑھ کر علمائے دین پر عائد ہوتا ہے۔ یہاں ہم خصوصیت سے علمائے دین کو ان کے گراں بہا فرض کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، کیونکہ ایک اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کی تعمیر میں سب سے زیادہ حصہ انہی لوگوں کو ادا کرنا پڑتا ہے جو اسلام میں مرتبہ علم و تفکر رکھتے ہوں۔ ذہنی لحاظ سے تاریخ کی باگ ڈور اسلامی پاکستان میں انہی حضرات کو تھامنی ہے، بشرطیکہ وہ اس منصب عظیم کے مطالبات پورے کرسکیں۔

اس منصبِ عظیم پر کچھ قابلِ قدر کام کر دکھانے کے لیے اولین ضرورت سینے وسیع اور بلند تر ذہن کی ہے۔ اجتماعی زندگی کے بناؤ سنوار کا کام کرنے والوں کو چھوٹے چھوٹے گروہی مقاصد سے بالاتر ہوکر اور جزئی اختلافات کو درکنار رکھ کر باہمی تعاون سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس منصب پر آکر بات بات پر فرقہ آرائیاں اور تکفیر و تفسیق کے مشغلے جاری نہیں رکھے جاسکتے۔ اور اگر ان مشاغل کو جاری رکھا گیا تو دینی صفوں کا انتشار لادینی طاقتوں کو اسلامی دستور بن جانے کے باوجود موقع مہیا کر دے گا کہ اب تک کا کیا کرایا غارت ہوجائے اور کسی نظامِ باطل کے لیے چوپٹ راستے کھل جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر علماء کے لیے اسلام کا نام تک لینے کے مواقع نہ رہیں گے اور اس کی ذمہ داری عند الناس بھی اور عند اللہ بھی انہی کے سر ہوگی۔ آج جو عالمِ دین اپنا فرض نہیں پہچانتا اور چھوٹے چھوٹے جزئی امور پر ہنگامہ آرائیاں کرتا ہے، اور کسی کے ایمان و احترام سے کھیلتا ہے اور گروہی محاذ کھولتا ہے وہ دانستہ نہیں تو نادانستہ کئے کرائے کو غارت کرنے کے درپے ہے۔

اسی طرح اس منصبِ عظیم پر کام کرنے والوں کو اب لوگوں کو خوش کرنے والے وعظوں، مناظروں اور

فتوے بازیوں کے کھیل تماشے بند کر کے نہایت سنجیدگی سے عوام کے ذہن و کردار کی تعمیر کا خشک اور ٹھوس کام کرنا چاہیے اور اپنے کام کا جائزہ اس پیمانے سے لینا چاہیے کہ کتنی زندگیاں بدلیں، کتنے لوگوں کو الحاد اور فسق و فجور، حرام خواری اور بدکاری کے طوفان میں ڈوبنے سے بچا نکالا، کتنے ذہنوں اور کتنے گھروں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اب ضرورت ہے کہ لوگوں کو چھچھلے پن اور دماغی تفریح کی مزید خوراکیں دینا بند کر کے ان کو سنجیدگی، وقار، نظم اور شائستگی کا درس دیا جائے۔ ان کی زبان، بول چال، نشست و برخواست، سیاسی سرگرمیوں معیشت اور گھریلو زندگیوں کو اسلام کے مطابق مہذب بنایا جائے۔

پھر یہ منصبِ عظیم یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ علمائے کرام اپنے خطابات، اپنے درس، اور اپنے علمی کاموں کا دائرۂ اثر وسیع تر کریں اور اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کو اپنا موضوع بنا کر کام کریں، کیونکہ اب پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک غیر اسلامی نظامِ تمدن میں محض اسلام کا نام زندہ رکھنے کا سوال ہو بلکہ اب تو خود اسلامی تمدن کی تعمیر کی جانی ہے اور اس کے لیے علم و فکر کا مسالہ فراہم کرنا ہے۔

ان گذارشات کے ساتھ یہ انتباہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے محل پر "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کا لوح آویزاں کر کے ہمارے حکمرانوں، لیڈروں، علما اور ہم عام لوگوں نے ذمہ داریوں کے پہاڑ اپنے سر لے لیے ہیں۔ ہم نے ایک بڑا بول بولا ہے، ایک بھاری دعویٰ کیا ہے، اور اب اس بول اور اس دعوے کی لاج رکھنا ہم پر واجب ہو گیا ہے۔ اب ہم قومی حیثیت میں جو جو اقدامات کریں گے وہ سب کے سب دنیا کی نگاہوں میں اسلام سے منسوب ہوں گے۔ اب ہماری غلطیاں اور بدکرداریاں اسلام کو بدنام کرنے کا موجب ہوں گی۔ اب اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی ہماری عملی سرگرمیوں کو اسی حیثیت سے لیا جائے گا کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور یہی وہ نظام ہے جو کتاب و سنت نے دیا ہے۔ اب اگر اسلامی نظام کی تاسیس و تعمیر کا اعلان کر دینے کے بعد اپنی کوتاہیوں اور نالائقیوں کی وجہ سے ہم ناکام رہ جاتے ہیں تو ہماری یہ ناکامی دنیا کو اور خود مسلمانوں کو سرے سے نظریۂ اسلامی سے مایوس کر دے گی، وہ تاریخی حرکت جو تمام عالمِ اسلامی کی نئی نسلوں میں اسلام کے حق میں برپا ہے اس پر اوس پڑ جائے گی اور مغرب کی ملحدانہ مادی تہذیب

نجات پانے کے لیے امید کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔

اب ہم کسی کے غلام نہیں، ہمارے اوپر کسی غیر کا تسلط نہیں، ہمارے راستے میں کسی غیر مسلم اکثریت کی سیاسی طاقت سدِ راہ نہیں، اسلام پر عمل پیرا ہونے میں اب کوئی دستوری روک حائل نہیں، ہم آزاد قوم ہیں، خود مختار ریاست ہیں اور اسلام پر ایمان رکھنے والوں کی بھاری اکثریت ملک میں رکھتے ہیں۔ اب بھی اگر جان بوجھ کر ہم قانونِ الٰہی سے انحراف جاری رکھتے ہیں اور اب بھی اگر خواہشِ نفس کے تحت غیر اسلامی نظریات و رجحانات کا دامن تھام کر چلتے ہیں تو یہ روش اسلام سے غداری اور نفاق کی روش ہی ہو سکتی ہے۔ مسلمان کہلا کر اور اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر پھر جو طاقت آزادی و اختیار کی حالت میں غداری و نفاق کی روش اختیار کرتی ہے اس کے لیے قانونِ الٰہی بڑا ہی سخت ہے، ایسی قوم کی آزادی تو کجا، سرے سے اس کا وجود ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ یوں بھی تاریخی تجربات اور تمدنی قوانین سے یہ حقیقت قطعی طور پر ثابت ہے کہ غداری و نفاق میں مبتلا ہونے والی قومیں ترقی، آزادی اور زندگی سے محروم کر دی جاتی ہیں۔

پس ہماری آزادی اور ہمارا اسلامی دستور جہاں ہمارے لیے بڑی قابلِ قدر نعمت ہیں وہاں ایک سنگین آزمائش بھی ہیں۔ ہم سب کو پوری جدوجہد کرنی چاہیے کہ ہم اس آزمائش میں ناکام نہ ہوں اور اس نعمت کا کفران کر کے اپنی دنیا و عافیت کو تباہ نہ کر لیں۔ خدا ہماری مدد کرے، ہمیں سہارا دے، ہمیں ایمان و عمل کی صلاحیتیں دے اور ہمارے ہاتھوں تاریخ میں ایک دورِ سعادت کا افتتاح کرائے۔ وباللہ التوفیق!

اس موقع پر اچانک جدا ہو جانے والے ایک رفیق کی یاد ذہن میں تازہ ہے جس نے اسلامی دستور کی جدوجہد میں دماغ اور زبان اور قلم اور ہاتھ پاؤں سے پورا پورا حصہ ادا کیا اور جو نئے مرحلے کا نقشہ کار ساتھ لیے پچھلے دنوں میدانِ عمل میں مصروفِ تگ و تاز تھا۔ ہمارے یہ بیش قیمت رفیق چوہدری علی احمد خاں تھے۔ مرحوم جماعت اسلامی میں آنے سے قبل محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ لیکن اس محکمے کے معروفِ عام مزاج کے بخلاف ایک حساس دل اور ایک زندہ ضمیر اپنے سینے میں رکھتے تھے۔ مطالعہ کا شوق ابتدا سے تھا خصوصاً اعلیٰ پایے کا اسلامی لٹریچر، چاہے وہ کسی بھی ادارے سے شائع ہوتا ہو، تلاشِ حق کے سچے جذبہ سے

پڑھتے رہے۔ اسی تلاشِ حق کے جذبے سے مختلف علما و مفکرینِ اسلام سے خط و کتابت کی، اپنے اشکال ان کے سامنے رکھے اور ان کے باہمی اختلافات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مرحوم کے پاس اکابر کے علمی خطوط کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ تلاشِ حق کی یہی کاوش ان کو ایک ایک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد جماعت اسلامی کے اندر لے آئی۔ آئے تو بالفاظ خویش کشتیاں جلا کر آئے، یعنی نوکری ترک کر دی اور رزقِ حلال کے حصول کے لیے پھلور میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول دیا جہاں وہ اپنے گاہکوں کی پیٹ کی بھوک مٹانے کا سروسامان بھی کرتے اور ان کے دلوں اور روحوں کی غذا بھی پیش کرتے۔ اس معاشی تگ و دو کے ساتھ دینی پہلو سے بھی اور جدید علوم کے پہلو سے بھی اپنا مطالعہ روز افزوں رفتار سے جاری رکھا۔ کتابیں خریدنے کا شوق تھا، چنانچہ ایک بیش قیمت ذاتی لائبریری چھوڑی ہے۔ اس لحاظ سے اپنے آپ کو علمی حیثیت سے تھوڑی سی مدت میں ترقی کے جس مرتبے پر پہنچایا، اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریر و تحریر کی استعداد بہم پہنچا کر زبان و قلم سے تحریک اسلامی کی بیش بہا خدمات انجام دیں، اور متعدد کتابیں لکھیں جس میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں اور بہت سا مواد قابلِ ترتیب و اشاعت ہے۔ پھر خوبی یہ ہے کہ یہ شخص جماعت اسلامی کی صفِ اول میں رہنے اور مختلف اہم انتظامی مناصب کو سنبھالنے کے باوجود ہمیشہ ایک سپاہی اور ایک کارکن رہا۔ تحریک کے دینی و سیاسی اور اصولی و اجتہادی پہلوؤں میں پورا توازن قائم کر کے سوچنے کے لحاظ سے بھی مرحوم نے ایک اچھی مثال قائم کی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک اپنے سے بڑے اور اپنے سے چھوٹے رفقا کے ساتھ یکساں محبت و بے تکلفی رکھنے، ذاتی رابطہ قرابت پیدا کرنے، ذہن کو چھوٹی چھوٹی احساساتی الجھنوں سے صاف رکھنے، گفتگو میں ایک مسکراتے چہرے کو اپنا ترجمان بنانے اور کارِ دعوت کے لیے ہر طریقے میں نفوذ کرنے کی مختلف خوبیاں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو گئی تھیں۔ جماعت نے جو کام جس مرحلے میں سونپا اسے ذوق و شوق سے لبیک کہا اور پھر اسے خلوص و محنت سے سرانجام دے کر، امیرِ جماعت، ارکانِ مجلس شوریٰ اور جملہ رفقا کے دلوں میں خاص جگہ حاصل کی۔ چنانچہ ماضی قریب میں مشرقی پاکستان میں تھوڑا سا عرصہ کام کر کے حالات کو اتنا آگے بڑھا دیا کہ اس کا صحیح اندازہ امیرِ جماعت کے دورۂ مشرقی پاکستان پر ہوا۔ حال میں

حلقہ لائل پور کو تنظیمی لحاظ سے مضبوط تر بنانے کی جو طوفانی جدوجہد انھوں نے شروع کی تھی اس کے نتائج چند ہی دنوں میں محسوس ہونے لگے تھے۔ ابھی خدا کے دین کا یہ سپاہی اپنے گھر بار اور اپنی صحت تک سے بے پروا ہو کر دوڑ دھوپ ہی میں محو ہی تھا کہ عین حالتِ سفر میں عالم جاودانی سے بلاوا آگیا۔ اپنے ساتھیوں کو غمزدہ چھوڑ کر اچانک رخصت ہو جانے والے اس قیمتی رفیق کو خداوند تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اس کی مثال سے سبق لینے کی توفیق دے۔ جماعت کی صفوں میں اس کی کمی کو پورا کرے اور اس کے اہل و عیال اور اعزہ و اقربا کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

ہم سب اللہ کے ہیں، اور ہمیں اسی کے حضور لوٹ کر جانا ہے

تفہیم القرآن

النُّور

(۷)

یہ (منافق) اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں"۔ ان سے کہو "قسمیں نہ کھاؤ، تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے[۸۱]۔ تمہارے کرتوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے[۸۲]"۔ کہو "اللہ کے مطیع بنو اور رسول کے تابعِ فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم۔ اُس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے۔ ورنہ رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے"۔

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو

۸۱؎ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان سے جو اطاعت مطلوب ہے وہ معروف اور معلوم قسم کی اطاعت ہے جو ہر شبہ سے بالاتر ہو، نہ کہ وہ اطاعت جس کا یقین دلانے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پڑے اور پھر بھی یقین نہ آسکے۔ جو لوگ حقیقت میں مطیع فرمان ہوتے ہیں ان کا رویہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص ان کے طرزِ عمل کو دیکھ کر محسوس کر لیتا ہے کہ یہ اطاعت گزار لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ اسے رفع کرنے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پیش آئے۔

۸۲؎ یعنی یہ فریب کاریاں مخلوق کے مقابلے میں تو شاید چل بھی جائیں مگر اُس خدا کے مقابلے میں کیسے چل سکتی ہیں جو کھلے اور چھپے سب حالات، بلکہ دلوں کے مخفی ارادوں اور خیالات تک سے واقف ہے۔

اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے ، اور اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے ، اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا ، بس وہ میری بندگی کریں ، اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں[۸۳] ۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے[۸۴] تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں ۔ نماز قائم کرو ، زکوٰۃ دو ، اور رسول کی اطاعت کرو ، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا ۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں

[۸۳] جیسا کہ اس سلسلۂ کلام کے آغاز میں ہم اشارہ کر چکے ہیں ، اس ارشاد سے مقصود منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردمِ شماری کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں ، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں ، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں ، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں ۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے ۔ لہٰذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں ۔

بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و تمکّن کے معنی میں لے لیتے ہیں ۔ پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگی حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے ، اور اس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے ایمان ، صلاح ، دینِ حق ، عبادتِ الٰہی اور شرک ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو ان کے اس نظریے کے مطابق ہو ۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے ۔ اس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنی پہنا دیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے ۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنھوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکّن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں ، خواہ وہ خدا ، وحی ، رسالت ، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فسق و فجور کی ان تمام آلائشوں میں بُری طرح لتھڑے ہوئے ہوں جنھیں قرآن نے کبائر

قرار دیا ہے ، جیسے سود، زنا، شراب اور جوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومن صالح ہیں اور اسی لیے خلافت کے منصب عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنی قوانینِ طبیعی کو ماننے اور صلاح کے معنی اُن قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں ؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علوم طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی پھر اس کے سوا اور کیا رہتی ہے کہ اُن قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں ؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ ان مفید قواعد و ضوابط کے ساتھ نقصان دہ طریقوں کی آمیزش کی جائے۔ مگر کیا کوئی شخص جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو ، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عمل صالح اور دین حق اور عبادتِ الٰہی اور توحید اور شرک کے یہی معنی ہیں ؟ یہ معنی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اُس کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھال لیا ہو ، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے اُن سب آیات کو اپنے زعم میں سراسر لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور الٰہ اور اس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعۂ ہدایت اور اس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو حتمی طور پر واجب الاطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے ، اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اُس زندگی میں اپنی جواب دہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اس دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح و صاف الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمانداری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی اُن غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیۃ استخلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ لفظ خلافت و استخلاف کے جس معنی پر انھوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے ، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنی کبھی نہیں لے سکتا۔

قرآن خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق و سباق سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں "خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا"۔ اس معنی میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں "خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امرِ شرعی (نہ کہ محض امرِ تکوینی) کے تحت اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا"۔ اس معنی میں صرف مومنِ صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے، کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس کافر و فاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے مُلک میں اس کے دئے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے معنی ہیں "ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا"۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی "نیابت" سے ماخوذ ہیں، اور آخری معنی خلافت بمعنی "جانشینی" سے ماخوذ۔ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغتِ عرب میں معلوم و معروف ہیں۔ اب جو شخص بھی یہاں اس سیاق و سباق میں آیتِ استخلاف کو پڑھے گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اُس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امرِ شرعی کے مطابق اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس کے وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے، اسی لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں، اسی لیے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کا پسندکردہ دین، یعنی اسلام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا اور اسی لیے اس انعام کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس وعدے کو یہاں سے اٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پر لے پہنچنا اور امریکہ سے لے کر روس تک جس کی کبریائی کا بھی ڈنکا دنیا میں بج رہا ہو اُس کے حضور اسے نذر کر دینا جہالت کی طغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے، بلاواسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالتِ خوف طاری تھی اور دینِ اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔

ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے

اس کے چند سال بعد یہ حالتِ خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں، کرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنا یہ وعدہ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومنِ صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالٰی خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو وہ نہج البلاغہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انھوں نے حضرت عمرؓ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں :

"اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت و قلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا لشکر ہے جس کی اس نے تائید و نصرت فرمائی، یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرما چکا ہے وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض ..... اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا۔ اسلام میں قیّم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور پراگندہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں۔ مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جمے بیٹھے رہیں اور عرب کی چکی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آ جائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی

[۸۵] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، لازم ہے کہ تمہارے مملوک[۸۶] اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں[۸۷]، تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے، اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت

بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہوگی۔ اور اُدھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظر جما دیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے، اسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے، اس لیے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہل عجم بڑی کثیر تعداد میں امنڈ آئے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہم جو اُن سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے۔"

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس تقریر میں جناب امیرؓ کس کو آیت استخلاف کا مصداق ٹھیرا رہے ہیں۔

[۸۴] کفر سے مراد یہاں کفرانِ نعمت بھی ہو سکتا ہے اور انکارِ حق بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کے مصداق وہ لوگ ہوں گے جو نعمتِ خلافت پانے کے بعد طریقِ حق سے ہٹ جائیں۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کے مصداق منافقین ہوں گے جو اللہ کا یہ وعدہ سن لینے کے بعد بھی اپنی منافقانہ روش نہ چھوڑیں۔

[۸۵] یہاں سے پھر احکامِ معاشرت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعید نہیں کہ سورۂ نور کا یہ حصہ اوپر کی تقریر کے کچھ مدت بعد نازل ہوا ہو۔

[۸۶] جمہور مفسرین و فقہاء کے نزدیک اس سے مراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں، کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ابن عمرؓ اور مجاہد اس آیت میں مملوکوں سے مراد صرف غلام لیتے ہیں اور لونڈیوں کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے جو حکم بیان کیا گیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے اس تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تخلیہ کے اوقات میں جس طرح خود اپنے بچوں کا اچانک آجانا مناسب نہیں اُسی طرح خادمہ کا بھی آجانا غیر مناسب ہے۔

تمہارے لیے پردے کے وقت ہیں۸۸ؒ۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ اُن پر۸۹ؒ، تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۹۰ؒ۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے

یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس آیت کا حکم بالغ و نابالغ دونوں قسم کے مملوکوں کے لیے عام ہے۔

۸۷ؒ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالغوں کا سا خواب دیکھنے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ اسی سے فقہاء نے لڑکوں کے معاملہ میں احتلام کو بلوغ کا آغاز مانا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن جو ترجمہ ہم نے متن میں اختیار کیا ہے وہ اس بنا پر قابل ترجیح ہے کہ یہ حکم لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لیے ہے، اور احتلام کو علامتِ بلوغ قرار دینے کے بعد حکم صرف لڑکوں کے لیے خاص ہو جاتا ہے، کیونکہ لڑکی کے معاملہ میں ایام ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے نہ کہ احتلام۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حکم کا منشا یہ ہے کہ جب تک گھر کے بچے اُس عمر کو نہ پہنچ جائیں جس میں ان کے اندر صنفی شعور بیدار ہوا کرتا ہے وہ اس قاعدے کی پابندی کریں، اور جب اُس عمر کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے لیے وہ حکم ہے جو آگے آ رہا ہے۔

۸۸ؒ اصل میں لفظ عَورات استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "یہ تین وقت تمہارے لیے عورات ہیں"۔ عورت اُردو میں تو صنف اُناث کے لیے بولا جاتا ہے مگر عربی میں اس کے معنی خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اُس چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کا کھل جانا آدمی کے لیے باعث شرم ہو یا جس کا ظاہر ہو جانا اس کو ناگوار ہو، نیز اس معنی میں بھی یہ مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنی باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور آیت کے مفہوم میں کسی نہ کسی حد تک سبھی شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اوقات میں تم لوگ تنہا، یا اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتے ہو جن میں گھر کے بچوں اور خادموں کا اچانک تمہارے پاس آ جانا مناسب نہیں ہے، لہٰذا اُن کو یہ ہدایت کرو کہ ان تین وقتوں میں جب وہ تمہاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

۸۹ؒ یعنی ان تین وقتوں کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے مملوک ہر وقت عورتوں اور مردوں کے پاس اُن کے کمرے میں یا اُن کے تخلیے کی جگہ میں بلا اجازت آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلا اجازت آ جائیں تو تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ

اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں[۹۱] تو چاہیے کہ اسی طرح اجازت لے کر آیا کریں جس طرح اُن کے بڑے اجازت لیتے ہیں۔ اس طرح اللہ اپنی آیات تمہارے سامنے کھولتا ہے، اور وہ علیم و حکیم ہے۔

پھر یہ تمہاری اپنی حماقت ہوگی کہ کام کاج کے اوقات میں اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھو۔ البتہ اگر تخلیے کے مذکورہ بالا تین اوقات میں وہ بلا اجازت آجائیں، تو وہ قصور وار ہیں اگر تمہاری تربیت و تعلیم کے باوجود یہ حرکت کریں، ورنہ تم خود گناہ گار ہو اگر تم نے اپنے بچوں اور مملوکوں کو یہ تہذیب نہیں سکھائی۔

۹۰ یہ وجہ ہے اُس اجازتِ عام کی جو تین اوقات مذکورہ کے سوا دوسرے تمام اوقات میں بچوں اور مملوکوں کو بلا اجازت آنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس سے اصولِ فقہ کے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں، اور ہر حکم کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے، خواہ وہ بیان کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

۹۱ یعنی بالغ ہو جائیں۔ جیسا کہ اوپر حاشیہ نمبر ۸۷ میں بیان کیا جا چکا ہے، لڑکوں کے معاملے میں احتلام اور لڑکیوں کے معاملے میں ایام ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے۔ لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک ان جسمانی تغیرات سے خالی رہ جائیں اُن کے معاملہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد کے نزدیک اس صورت میں ۱۵ برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا، اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم کا مشہور قول یہ ہے کہ اس صورت میں ۱۷ برس کی لڑکی اور ۱۸ برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا۔ یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں بلکہ فقیہانہ اجتہاد پر مبنی ہیں، لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہمیشہ ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر ہی کو غیر محتلم لڑکوں اور غیر حائضہ لڑکیوں کے معاملے میں حدِ بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں، اور مختلف زمانوں میں جسمانی نشوونما کے حالات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عموماً کسی ملک میں جن عمروں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتلام اور ایام ماہواری ہونے شروع ہوتے ہوں

اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں[۹۲]، نکاح کی امید وار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر

اُن کا اوسط فرق نکال لیا جائے، اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے مُعتاد وقت پر نہ ظاہر ہوں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مُعتاد عمر پر اس اوسط کا اضافہ کر کے اُسے بلوغ کی عمر قرار دے دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعموم کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو، تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہوگا اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لیے ہم ساڑھے سولہ برس کی عمر کو سنّ بلوغ قرار دے سکیں گے۔ اسی قاعدے پر مختلف ممالک کے اہل قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔

۱۵ برس کی حد کے حق میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، اور وہ ابن عمرؓ کی یہ روایت ہے کہ میں ۱۴ سال کا تھا جب غزوۂ اُحد کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے مجھے شریک جنگ ہونے کی اجازت نہ دی، پھر غزوۂ خندق کے موقع پر، جب کہ میں ۱۵ سال کا تھا، مجھے دوبارہ پیش کیا گیا اور آپ نے مجھ کو اجازت دے دی (صحاح ستہ و مُسند احمد)۔ لیکن یہ روایت دو وجوہ سے قابلِ استدلال نہیں ہے۔ اول یہ کہ غزوۂ احد شوال ۳ھ کا واقعہ ہے اور غزوۂ خندق بقول محمد بن اسحاق شوال ۵ھ میں اور بقول ابن سعد ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ دونوں واقعات کے درمیان پورے دو سال یا اس سے زیادہ کا فرق ہے۔ اب اگر غزوۂ احد کے زمانے میں ابن عمر ۱۴ سال کے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ غزوۂ خندق کے زمانے میں وہ صرف ۱۵ سال کے ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۳ سال ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۴ سال اور ۱۵ برس ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۵ سال کہہ دیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے لیے بالغ ہونا اور چیز ہے اور معاشرتی معاملات میں قانوناً بالغ ہونا اور چیز۔ ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے کے لیے دلیل بنایا جا سکے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ غیر محتلم لڑکے کے لیے ۱۵ برس کی عمر مقرر کرنا ایک قیاسی و اجتہادی حکم ہے، کوئی منصوص حکم نہیں ہے۔

۹۲ اصل میں لفظ قواعد من النساء کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوں یا "بیٹھی ہوئی عورتیں"۔ اس سے مراد ہے سنِّ یاس، یعنی عورت کا اُس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد

رکھ دیں[۹۳] تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں[۹۴]۔ تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو اُن کے حق میں اچھا ہے، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا، یا لنگڑا، یا مریض (کسی کے گھر سے کھا لے) اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا اُن گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے[۹۵]۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ، یا

پیدا کرنے کے قابل نہ رہے، اس کی اپنی خواہشات بھی مر چکی ہوں اور اس کو دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ نہ پیدا ہو سکتا ہو۔ اِسی معنی کی طرف بعد کا فقرہ اشارہ کر رہا ہے۔

[۹۳] اصل الفاظ ہیں یضعن ثیابھن "اپنے کپڑے اتار دیں"۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد سارے کپڑے اتار کر برہنہ ہو جانا تو نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تمام فقہا اور مفسرین نے بالاتفاق اس سے مراد وہ چادریں لی ہیں جن سے زینت کو چھپانے کا حکم سورۂ احزاب کی آیت یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ میں دیا گیا تھا۔

[۹۴] اصل الفاظ ہیں غیر متبرجات بزینۃ "زینت کے ساتھ تبرج کرنے والی نہ ہوں"۔ تَبَرُّج کے معنی ہیں اظہار و نمائش کے۔ بارج اُس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر چھت نہ ہو۔ اس معنی میں عورت کے لیے یہ لفظ اُس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ مردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرائش کا اظہار کرے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ چادر اتار دینے کی یہ اجازت اُن بوڑھی عورتوں کو دی جا رہی ہے جن کے اندر بن ٹھن کر رہنے کا شوق باقی نہ رہا ہو اور جن کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں۔ لیکن اگر اس آگ میں کوئی چنگاری ابھی باقی ہو اور وہ نمائشِ زینت کی شکل اختیار کر رہی ہو تو پھر اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

[۹۵] اس آیت کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ آیت کے دو حصے ہیں

الگ الگ[96]۔ البتہ جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔

پہلا حصہ بیمار، لنگڑے، اندھے اور اسی طرح کے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں ہے، اور دوسرا عام لوگوں کے بارے میں۔ دوم یہ کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے اہل عرب کی ذہنیت میں جو زبردست انقلاب واقع ہوا تھا اس کی وجہ سے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں ان کی حس انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ ابن عباس کے بقول، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو حکم دیا کہ لَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ) تو لوگ ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے میں بھی سخت احتیاط برتنے لگے تھے، حتیٰ کہ بالکل قانونی شرطوں کے مطابق صاحبِ خانہ کی دعوت و اجازت جب تک نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ کسی عزیز یا دوست کے ہاں کھانا بھی ناجائز ہے۔ سوم یہ کہ اس میں اپنے گھروں سے کھانے کا جو ذکر ہے وہ اجازت دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ ذہن نشین کرنے کے لیے ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا، ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے گھر سے کھانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ان تین باتوں کو سمجھ لینے کے بعد آیت کا یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک معذور آدمی کا تعلق ہے، وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لیے ہر گھر اور ہر جگہ سے کھا سکتا ہے، اس کی معذوری بجائے خود سارے معاشرے پر اس کا حق قائم کر دیتی ہے، اس لیے جہاں سے بھی اس کو کھانے کے لیے ملے وہ اس کے لیے جائز ہے۔ رہے عام آدمی تو اُن کے لیے ان کے اپنے گھر اور اُن لوگوں کے گھر جن کا ذکر کیا گیا ہے، یکساں ہیں، ان میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحبِ خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں ورنہ خیانت ہوگی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی کے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جا سکتا ہے۔

جن رشتہ داروں کے نام یہاں لیے گئے ہیں اُن میں اولاد کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آدمی کی اولاد کا گھر اس کا اپنا ہی گھر ہے۔ دوستوں کے معاملے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان سے مراد بے تکلف اور جگری دوست ہیں جن کی غیر موجودگی میں اگر یار لوگ ان کا حلوا اڑا جائیں تو ناگوار گزرنا تو درکنار انہیں اس پر الٹی خوشی ہو۔

[96] قدیم زمانے کے اہل عرب میں بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ ہر ایک الگ الگ کھانا لے کر بیٹھے اور کھائے

اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے۔
۶۲ مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور رسول کو دل سے مانیں، اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔[۹۸] جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں[۹۹] تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو[۱۰۰] اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو،[۱۰۱] اللہ یقیناً غفور ورحیم ہے۔

وہ مل کر ایک ہی جگہ کھانا برا سمجھتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کے ہاں آج بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض قبیلے تنہا کھانے کو برا جانتے تھے، حتیٰ کہ فاقہ کر جاتے تھے اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہو۔ یہ آیت اسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

۹۷ یہ آخری ہدایات ہیں جو مسلمانوں کی جماعت کا نظم و ضبط پہلے سے زیادہ کَس دینے کے لیے دی جارہی ہیں۔

۹۸ یہی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشینوں اور اسلامی نظام جماعت کے امراء کا بھی ہے۔ جب کسی اجتماعی مقصد کے لیے مسلمانوں کو جمع کیا جائے، قطع نظر اس سے کہ جنگ کا موقع ہو یا حالتِ امن کا، بہرحال ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر واپس چلے جائیں یا منتشر ہو جائیں۔

۹۹ اس میں یہ تنبیہ ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر اجازت طلب کرنا تو سرے سے ہی ناجائز ہے۔ جواز کا پہلو صرف اس صورت میں نکلتا ہے جب کہ جانے کے لیے کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو۔

۱۰۰ یعنی ضرورت بیان کرنے پر بھی اجازت دینا یا نہ دینا رسول کی، اور رسول کے بعد امیرِ جماعت کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہو کہ اجتماعی ضرورت اس شخص کی انفرادی ضرورت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے تو وہ پورا حق رکھتا ہے کہ اجازت نہ دے، اور اس صورت میں ایک مومن کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

۱۰۱ اس میں پھر تنبیہ ہے کہ اجازت طلب کرنے میں اگر ذرا سی بہانہ بازی کا بھی دخل ہو، یا اجتماعی

مسلمانو! اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو ۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے سٹک جاتے ہیں ۔ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار

ضروریات پر انفرادی ضروریات کو مقدم رکھنے کا جذبہ کارفرما ہو تو یہ ایک گناہ ہے ۔ لہٰذا رسول اور اس کے جانشین کو صرف اجازت دینے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ جسے بھی اجازت دے ، ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہہ دے کہ خدا تمہیں معاف کرے ۔

۱۰۲ اصل میں لفظ "دعاء" استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلانے کے بھی ہیں اور دعا کرنے اور پکارنے کے بھی نیز دعاء الرسول کے معنی رسول کا بلانا یا دعا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور رسول کو پکارنا بھی ۔ ان مختلف معنوں کے لحاظ سے آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی صحیح و معقول ہیں :۔

اوّل یہ کہ "رسول کے بلانے کو عام آدمیوں میں سے کسی کے بلانے کی طرح نہ سمجھو" یعنی رسول کا بلاوا غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ۔ دوسرا کوئی بلائے اور تم لبیک نہ کہو تو تمہیں آزادی ہے لیکن رسول بلائے اور تم نہ جاؤ، یا دل میں ذرہ برابر بھی تنگی محسوس کرو، تو ایمان کا خطرہ ہے ۔

دوم یہ کہ "رسول کی دعا کو عام آدمیوں کی سی دعا نہ سمجھو" وہ تم سے خوش ہو کر دعا دیں تو تمہارے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور ناراض ہو کر بددعا دے دیں تو تمہاری اس سے بڑھ کر کوئی بدنصیبی نہیں

سوم یہ کہ "رسول کو پکارنا عام آدمیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی طرح نہیں ہے" ۔ یعنی تم عام آدمیوں کو جس طرح ان کے نام لے کر بآواز بلند پکارتے ہو اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارا کرو ۔ اس معاملے میں ان کا انتہائی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے ، کیونکہ ذرا سی بے ادبی بھی اللہ کے ہاں مواخذے سے نہ بچ سکے گی ۔

یہ تینوں مطلب اگرچہ معنی کے لحاظ سے صحیح ہیں اور قرآن کے الفاظ تینوں کو شامل ہیں ، لیکن بعد کے مضمون سے پہلا مطلب ہی مناسبت رکھتا ہے ۔

۱۰۳ یہ منافقین کی ایک اور علامت بتائی گئی ہے کہ اسلام کی اجتماعی خدمات کے لیے جب بلایا جاتا ہے

نہ ہو جائیں ۱۰۴ یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے ۔ خبردار رہو۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا
ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ جس روز تم اس کی طرف پلٹو گے وہ تمہیں بتا دے گا
کہ تم کیا کچھ کر کے آئے ہو۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ع ع ۹

تو وہ آتو جاتے ہیں، کیونکہ مسلمانوں میں کسی نہ کسی وجہ سے شامل رہنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حاضری ان کو سخت
ناگوار ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر نکل بھاگتے ہیں۔

۱۰۴ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فتنے کا مطلب "ظالموں کا تسلّط" لیا ہے۔ یعنی اگر مسلمان رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو ان پر جابر و ظالم حکمران مسلط کر دئے جائیں گے۔
بہرحال فتنے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اور اس کے سوا دوسری بے شمار صورتیں بھی ممکن ہیں۔ مثلاً
آپس کے تفرقے اور خانہ جنگیاں، اخلاقی زوال، نظامِ جماعت کی پراگندگی، داخلی انتشار، سیاسی اور مادی
طاقت کا ٹوٹ جانا، غیروں کا محکوم ہو جانا وغیرہ۔

محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

(مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے)

مدنی دور

نعیم صدیقی

(۴)

یہود کا تاریخی مقام اور پارٹ تاریخِ اسلام وجاہلیت کی یہ عجیب ٹریجیڈی ہے کہ دینِ حق کی مزاحمت کرنے کی خدمت سب سے بڑھ کر "جوشِ ایمانی" کے ساتھ ہمیشہ اہلِ مذہب ہی نے سرانجام دی ہے۔ اہلِ مذہب جن کو دینِ حق کی دعوت کی پہلی آواز سنتے ہی اولین صفوں میں جا کھڑے ہونا چاہیے، وہی ہمیشہ "اوّل کافر بہ" بنتے رہے ہیں (الاماشاء اللہ)۔ اہلِ مذہب ابتدا میں مذہب کے خادم اور علمبردار ہوتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ جب ان کا ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے کچھ مفاد مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ مذہب کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ مذہب کے نام پہ اپنے کچھ مستقل حقوق پیدا کر لیتے ہیں، پیروانِ مذہب سے وہ کچھ اپنے طبقاتی مطالبات منوا لیتے ہیں اور کچھ اعزازات ان کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ مذہب اپنے پیروؤں کے دورِ زوال میں ہمیشہ انہی مراحل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مذہب ایک اچھے نفع بخش کاروبار کی سطح پر آجاتا ہے اور وہ ایک موروثی جاگیر بنتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وعظ مالِ تجارت بن جاتے ہیں، علم ذریعہ معاش ٹھہرتا ہے، فتوے متاعِ بازار بن کر اپنا ایک مارکیٹ ریٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ دینی مناصب روحانی قیادت و اقتدار کا زینہ قرار پاتے ہیں۔ اس مقام پر جب ایک بار اہلِ مذہب آ پہنچتے ہیں تو پھر ان کا کاروباری ذہن ہر معاملے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا مفاد محفوظ رہتا ہے یا نہیں، اور ہمارا منصب اور

اور ہماری پوزیشن کسی اور طرف تو منتقل نہیں ہوتی جاتی۔ کاروباری ذہن جب ان اوصاف کے ساتھ دائرۂ مذہب میں آگھستا ہے تو اہل مذہب :

— کسی کی طرف سے اختلاف کو گوارا نہیں کر سکتے اور نہ کسی بڑے مقصد کے لیے دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

— اپنے اندر کسی کمزوری یا غلطی کو ماننے اور اس کی اصلاح کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

— قیادت و اثر کی کرسی چھوڑ کر کسی دوسرے کی دعوت پر ادائے فرض نہیں کر سکتے۔

ٹھیک یہی مقام تھا جس کی آخری سرحد پر یہود آ پہنچے تھے۔ وہ یہ ہرگز نہیں مان سکتے تھے کہ حق ان کے گروہی دائرہ کے باہر بھی پایا جا سکتا ہے، وہ نہیں مان سکتے تھے کہ ان کے پیچھے لگ کر چلے بغیر بھی کوئی رزہ یاب ہو سکتا ہے، وہ نہیں مان سکتے تھے کہ رہنمائی کا منصب کسی دوسرے کو بھی مل سکتا ہے۔

مخالفت قریش مکہ نے بھی کی اور مخالفت یہود نے بھی کی اور دونوں میں سے کسی نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر دونوں کے مخالفانہ پارٹ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ جب ہم تجزیہ و موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو اولین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت میں اصل کارفرما روح جذبۂ استکبار کی تھی، لیکن یہود پر حسد کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔ وہاں احساسِ برتری کی بیماری تھی اور یہاں احساسِ کہتری کا روگ تھا۔ اسی لیے وہاں کھلا کھلا انکار اور تصادم تھا اور یہاں مکاری اور عیاری کا مزاج مخالفانہ سرگرمیوں میں نمایاں تھا۔ وہاں بہادرانہ جسارت تھی اور یہاں بزدلانہ شرارت! وہاں مخالفت سیدھی تشدد کے رخ پر ارتقا کرتی رہی تھی، لیکن یہاں وہ نجویٰ اور سازش اور نفاق کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مکہ میں صرف مسلم اور کافر دو گروہ تھے لیکن مدینہ میں مسلم اور کافر طاقتوں کے بیچ میں ایک تیسرا کردار نفاق کا بھی نمودار ہو گیا۔ اس مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جامد مذہبیت اور فاسد دین داری کھلے کھلے کفر و شرک اور صریح جاہلیت سے زیادہ پست فطرت رکھتی ہے اور مخالفتِ حق میں زیادہ گھٹیا کردار پیش کرتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس رزمِ کفر و دین میں یہود کی جامد مذہبیت اور فاسد دین داری نے اسلام کے مقابلے پر کفر و شرک کی طاقت کے پلڑے میں اپنا پورا پورا وزنِ تعاون ڈال دیا، حالانکہ بڑے سے

بڑے اختلاف کے باوجود اسے خداپرستانہ واخلاق پسندانہ مسلک کے علمبرداروں کے ساتھ زیادہ ہمدردیاں ہونی چاہئیں تھیں۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اس بات کی ہوسکتی تھی کہ یہود مخالفتِ اسلام میں اپنی پوزیشن کفار و مشرکین سے بالکل الگ اور ممیز رکھتے۔ لیکن تَعَالَوا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ کی دردمندانہ پکار سننے کے باوجود انھوں نے انسانِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاکیزہ دینی افکار و اعمال کو چھوڑ کر ابوجہل اور ابولہب جیسے گھٹیا انسانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور جامد مذہبیت اور فاسد دینداری کا یہ بھی ہمیشہ تاریخی رول رہا ہے کہ وہ معرکۂ کارزار میں دینی محاذ پر کسی قیمت کے عوض بھی اپنا تعاون پیش نہیں کرسکتی بلکہ لازماً وہ دین کی دشمن طاقتوں کی گود میں جاگرتی ہے۔ اس کا قارورہ ہمیشہ کفر و الحاد اور فسق و فجور کے پیکل سے ملتا ہے۔ یہاں گفتگو چند مستثنیٰ افراد پر نہیں ہو رہی جو کسی گروہ کے اندر سے بدترین دورِ فساد میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ہم عمومی کلیہ اخذ کر رہے ہیں۔

یہ تھا موقف جو یہود نے لیا! وہ اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور علم و تقویٰ کے سارے ہتھیار سنبھال کر تخریب پسندانہ منفیت کے مورچوں پر جا ڈٹے اور انھوں نے عملاً کفار و مشرکین کو اپنا پورا پورا تعاون پیش کردیا۔ انھوں نے داعیِ حق اور تحریکِ اسلامی اور اس کے کارکنوں کے خلاف پھبتیاں کسیں، مذاق اڑائے، نت نئے سوالات اور اعتراضات گھڑ گھڑ کر کٹ حجتیاں کیں، الزامات لگائے، پروپیگنڈے کے طوفان اٹھائے، مخبریاں اور جاسوسیاں کیں، مسلمانوں کو باہم دگر لڑانے کے منصوبے اختیار کئے، تکفیر و تفسیق کے فتوے لگائے۔ رحمتِ دو عالم کے قتل کی تدبیریں کیں اور جنگ اور امن دونوں کے حالات میں سخت قسم کی غداریاں کیں۔ اپنی طرف سے ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیا۔ لیکن شروع سے آخر تک یہ ایک بڑے مغالطے میں رہے ——— اور منفی مزاج کی تخریبی مہموں کو اٹھانے والی طاقتیں ہمیشہ اس مغالطے میں رہتی ہیں (لیکن بعد والوں کو ان سے سبق لینے کی بھی توفیق نہیں ہوتی) ——— کہ کسی اصولی اور تعمیری تحریک کا توڑ ایسے لوگ کامیابی سے کرسکتے ہیں جو خود بے اصول ہوں، کوئی تعمیری نقشہ نہ رکھتے ہوں اور جو اخلاقی پستی کی آخری گہرائیوں میں جاگرے ہوں۔ درحقیقت ایسے لوگوں کا پارٹ بالکل اس نوعیت کا ہوتا ہے جیسے چڑھتے سورج کی شعاعِ اولیں سے ڈر کر چمگادڑ فضا میں اپنے پر پھیلا کر زمانے کو تاریک رکھنے کے

درپے ہوں، جیسے شہسواروں کے کسی دستے کا راستہ روکنے کے لیے چند مچھر اور چند مکھیاں اپنی بھنبھناہٹ کا پورا زور شور دکھا دیں، جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھ کر کوئی گنوار اس کی طرف منہ اٹھا کر تھوک دے۔

جن لوگوں میں خود اپنی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی ہو، جن کے پاس کوئی جاندار پیغام موجود نہ ہو جن کا اخلاق و کردار زمانے کے لیے کوئی جاذبیت نہ رکھتا ہو اور جن سے کسی تعمیری خدمت کی توقع انسانیت کو نہ رہی ہو، وہ محض دوسروں کا راستہ روک کر اور ان کا منہ چڑا کر اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔ جن کے پاس جمود اور فساد اور بگاڑ اور تخریب کے سوا اور کوئی متاعِ حیات باقی نہ رہی ہو وہ اصلاحی و تعمیری کام کرنے والی کسی متحرک طاقت کے منہ آکر اپنے اندر قدر و قیمت پیدا نہیں کر سکتے۔ انجام کار ایسوں کے حصے میں ذلت و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں آتا مگر جب جذباتی ردِ عمل کی رَو میں بہہ کر کوئی فاسد طاقت اندھی ہو جاتی ہے تو پھر وہ انجام کو نہیں سوچتی، بس آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہود کی فاسد طاقت بھی احساسِ کہتری اور حسد کے مارے اندھی ہو کر اسلام سے اُلجھنے لگی۔

یہود کا کردار مسلمانوں کے کردار کے بالمقابل رکھ کر دیکھنے سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سچائی کے کسی علمبردار کی صدا پر لبیک کہنے والوں کا اخلاق جتنا بلند ہوتا جاتا ہے اس کی مخالفت کرنے والوں کی سیرتوں میں اتنا ہی زوال پیدا ہوتا جاتا ہے، مثبت تحریک اپنے دائرہ میں انسانیت کو جتنا زیادہ سنوارتی ہے منفی ردِ عمل اپنے حلقہ میں اتنا ہی زیادہ فساد اور بگاڑ پیدا کرتا چلا جاتا ہے

اسلامی معاشرہ کے سربراہ کار کے سامنے ایک طرف بڑا وسیع اور متعدد پہلو رکھنے والا تعمیری منصوبہ تھا، دوسری طرف مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی اور ان کو معاشی سہارا بہم پہنچانے کا پرابلم تھا تیسری طرف قریشِ مکہ کی طرف سے ہر لحظہ حملے کا امکان تھا اور اس کے لیے دفاعی استحکام کی ضرورت تھی: اور ان ساری مشکلوں میں اضافہ کرنے والی بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینہ کی نوخیز ریاست اور زیرِ تشکیل معاشرہ کے اپنے دائرے میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی بھاری تعداد فتنہ انگیزیاں کر رہی تھی۔ غور کرو کہ سرورِ عالم کی ذمہ داریاں کتنی نازک اور پیچیدہ ہو گئی ہوں گی۔ خیال میں لاؤ کہ ایک جان کتنی گوناگوں الجھنوں میں دن رات الجھی رہتی ہو گی۔ اندازہ کرو کہ چھوٹی سی اسلامی جماعت اور ابتدائی مراحل سے گذرتی ہوئی

تحریک کیسے جان جو کھم میں پڑی ہوگی ۔ اور اس ساری صورتِ حال کو پیدا کرنے کا سہرا تاریخ میں یہود کے سر بندھا نظر آتا ہے ـــــ جی ہاں ! ایک خدا کو ماننے والوں، ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے پروانوں، تورات کے علمبرداروں اور علم و تعقہ اور تقدس و تقویٰ کے ٹھیکیداروں کے سر!

" ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو "

ابتدا میں یہود کو حضور سرورِ عالمؐ اور اسلام سے بڑی اچھی امیدیں تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نئی طاقت انہی کی طرح بنو اسمٰعیل سے برسرِ اختلاف ہے یہود جن انبیا کے نام لیوا تھے ان کو مانتی ہے ان کی کتاب کا احترام کرتی ہے اور انہی کے مرکزِ عبادت، یعنی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بناتے ہوئے ہے بنا بریں ان کا اندازہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ ہم محمد رسول اللہ اور آپؐ کے رفقا کو اپنے اندر جذب کر لے جائیں گے۔ یہود کا ذہن حق پرستانہ طرز پر نہیں سوچ رہا تھا، بلکہ یہ خالص سوداگرانہ طرزِ فکر تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اجڑے پچڑے لوگ، جو سینکڑوں کی تعداد میں یوں اکھڑے چلے آ رہے ہیں، ان کو ہم اپنے باڑے کی بھیڑیں بنا سکیں گے، اسی امید پر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ بغیر کسی لمبی چوڑی ردّوکد کر کے معاہدات استوار کر لیے اور اُس سیاسی تنظیم کو گوارا کر لیا جو مدینہ میں قائم کی جا رہی تھی۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ یہ سیاسی طاقت جو اپنی کونپلیں نکال رہی ہے، یہ تو بس ہماری جیب میں ہے ۔ ہماری پیری اور مشیخت کی گدیاں اس کو چار جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ہمارے علم و تقویٰ کی ساکھ اپنا دامن اس کے اوپر پھیلائے ہوئے ہے ۔ کوئی سوال نہ تھا حق و صداقت تک رسائی حاصل کرنے کا، کوئی کاوش نہ تھی فکر و کردار کو سنوارنے کی، کوئی اہتمام نہ تھا عاقبت بنانے کا! مجرد ایک گروہی مفاد کی سیاست تھی جو ان کم بختوں کے سر پر سوار تھی۔ ان کے نزدیک تو گویا مدینہ کے ماحول میں ان کے گھر کے دروازوں پر شکار آ آکر جمع ہو رہا تھا اور وہ اپنے دام و فتراک تیار کیے گھات میں بیٹھے تھے ۔ ان کی نگاہ میں گویا مچھلیاں تھیں جو غول در غول ساحل کے پاس آ رہی تھیں اور یہ ماہی گیر کھلی ہوئی یا چھپی کے ساتھ مذہبی مکاری کی ڈوریاں اور کنڈیاں پانی میں ڈال رہے تھے ۔ مگر کچھ ہی مدت کے تجربے سے ان کی خوش فہمیوں کا خاتمہ ہونے لگا ۔ انہیں اسلامی جماعت نے جتا دیا کہ یہ کوئی سستا شکار نہیں ہے، یہ

ایسی مضبوط طاقت ہے کہ شکاری اس کے ہاتھوں خود شکار ہو کے رہ جانے والے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے آہستہ آہستہ ایک انقلابی مزاج کی ریاست پروان چڑھنے لگی اور یہ ریاست اپنے وجود میں ایک قلعے کی طرح مضبوط بنتی گئی، یہود کو چندہی دن میں معلوم ہو گیا کہ یہ ریاست جس کے بنانے میں دستوری معاہدہ کی بنا پر وہ خود بھی حصہ دار ہیں ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی نہیں بن سکتی، اور نہ اس میں انگلی دھنسانے کی ان کو کوئی جگہ مل سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے لیے جو مقامِ سیادت اس میں حاصل کرنا چاہا اس کے بارے میں ان کو جلدہی نامرادی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے مختلف اداروں اور سرگرمیوں میں انھوں نے نفوذ اور تصرف حاصل کرنے کی جو کوششیں کیں، ان میں بار بار منہ کی کھائی، اس ریاست کے صدر اور کار پردازوں اور اس کے اصولوں پر ایمان رکھنے والے شہریوں کو انھوں نے ہاتھ میں لینے کے جتنے بھی منصوبے اختیار کئے وہ سب ناکامی کا شکار ہو گئے، الٹا اولین مراحل میں یہ ہوا کہ یہود کے اپنے آدمیوں نے محسنِ انسانیت کی پیش کردہ صداقتوں کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا شروع کر دیا۔ یہ "خطرناک" انقلابی رَو عامیوں ہی کو نہیں، ان کی بعض سرکردہ ہستیوں کو بھی بہالے گئی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا سارا بازارِ تقدس اجڑ جانے والا ہے، اور ان کے باڑے کی بھیڑیں ایک ایک کر کے ہاتھ سے جانے والی ہیں۔ یہ سودا یہود کو بڑا مہنگا پڑا۔ ایک طرف وہ بروئے معاہدہ مسلم ریاست کے نظام کے پابند ہو چکے تھے، دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ دفاعی مقصد کے لیے حلیفانہ معاہدات استوار کر چکے تھے اور تیسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ جس مقصد کے لیے کیا گیا تھا وہ غارت ہوا جا رہا ہے، چنانچہ اندرہی اندر ان میں ایک حاسدانہ ابال پیدا ہونے لگا اور وقتاً فوقتاً یہ گندا مادہ ان کے اجتماعی بدن کے ناسوروں سے بہنے لگا۔ خصوصاً تحویلِ قبلہ پر تو یہ جذباتی پیپ یہودی سوسائٹی کے مسام مسام سے رسنے لگی! اس جذبہ نے اولاً شر انگیزی کا راستہ اختیار کیا، پھر یہ تخریبی کارروائیوں کی شکل میں ڈھلا، حتیٰ کہ مرتبۂ کمال تک پہنچ کر اس نے غداری کی صورت اختیار کر لی۔ آیئے ہم مدنی دور میں اس جذبہ کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والی ان مخالفانہ سرگرمیوں کا ایک جائزہ لیں جس سے انسانیت کا سب سے بڑا خیر خواہ اور اس کے ساتھی دوچار ہوئے اور جس سے اپنا وجود سلامتی کے ساتھ

بچا نکالنے کے لیے اسلامی ریاست کو سخت مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

کھچاؤ | مدینہ کی نوخیز اسلامی جماعت جن بھاری ذمہ داریوں میں گھری ہوئی تھی ان کے لحاظ سے اس کے ایک ایک فرد کی زندگی بڑی قیمتی تھی اور ایک ایک کارکن کا پارٹ بڑا اہم تھا۔ علی الخصوص جو لوگ صفِ اوّل کے کارکن تھے ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی سرورِ عالم اور آپ کے رفقا کے لیے بڑا بھاری حادثہ تھی۔ ابوامامہ اسعد بن زرارہ جو بنو نجار پر نقیب مقرر کیے گئے تھے، ایسا ہی اہم مقام رکھتے تھے۔ بالکل ابتدائی دور میں ان کو عالمِ آخرت سے بلاوا آگیا اور ایک جلیل القدر سپاہی تحریکِ اسلامی کی صفوں میں سے کم ہو گیا۔ حضورؐ کے لیے یہ صدمہ فی نفسہٖ بڑا صدمہ تھا، لیکن اس صدمہ کو مدینہ کی اسلام دشمن طاقت نے اپنے مفسدانہ پروپیگنڈے کے ذریعے دگنا کر دیا۔ یہود اور ان کا ساتھ دینے والے منافقین یہ کہتے پھرتے تھے کہ اجی کیا ہے، اگر یہ محمد کوئی سچا نبی ہوتا تو اس کا ایسا سرگرم ساتھی ایسے عالم میں کیوں مرا ہوتا۔ گویا مخالفین کے ہاں اس موت پر گھی کے چراغ جل گئے۔ وہ قلبِ حساس جو چاروں طرف سے دکھوں کے تیروں کی زد پر تھا، وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ بئس المیت ابوامامۃ! یہود ومنافقی العرب یقولون لو کان نبیاً لم یمت صاحبہ ولا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئاً[1]۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں کے دلوں کے پھوڑے کیسے پکے ہوئے تھے۔ بنو نجار نے آکر حضورؐ سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی اور نقیب مامور فرما دیجیے۔ بنو نجار کی تسکین کے لیے آپ نے خود اپنے آپ ہی کو بربنائے قرابت ان کا نقیب قرار دیا۔ "انتم أخوالی وانا بما فیکم، وانا نقیبکم"!

یہود نے جن شرائط پر دستوری معاہدہ پر دستخط ثبت کئے تھے، ان کی وجہ سے وہ اس پر قادر نہ تھے کہ تحریک اسلامی کو روز افزوں ترقی سے روک سکیں۔ ان کی ناک کے نیچے عامۃ الناس اور ان کے سربراہ کار اسلام کے جھنڈے کی طرف لپک رہے تھے اور ان کی گدیاں، اور پیریاں، ان کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲۔ ص ۵ "برا ہوا ابوامامہ کا مرنا۔ یہود اور منافقین عرب کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو اس کا ساتھی نہ مرتا، حالانکہ اللہ کی مشیت سے نہ میں خود بچ سکتا ہوں نہ اپنے کسی ساتھی کو بچا سکتا ہوں"

بعد متعہ کی تحریم نازل ہوئی ، اور معمر کی روایت میں یہ لفظ آیا ہے ، ثم نسخ ، پھر یہ نکاح منسوخ ہوگیا" فتح الباری ج ۹ ص۹۷

حدیث ۲ عن سبرۃ الجهنی قال امرنا رسول اللہ صلعم بالمتعۃ عام الفتح حین دخلنا مكۃ ثم لم نخرج منها حتى نهانا عنها وقال عبد العزيز بن عمر حدثنی الربيع بن سبرۃ ان اباہ حدثہ انہ كان مع رسول اللہ صلعم فقال ، يا ايها الناس انی قد كنت اذنت لكم فی الاستمتاع من النساء وان اللہ قد حرم ذلك الى يوم القيامۃ . فمن كان عندہ منهن شئ فليخل سبيلہ (مسلم)

سبرہؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکّہ کے سال جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تو حضورؐ نے ہمیں متعہ کرنے کی اجازت دے دی ، لیکن ابھی مکّہ سے ہم نکلے نہیں تھے کہ متعہ کرنے سے ہمیں منع فرمادیا ۔ عبدالعزیز ابن عمر کہتے ہیں کہ ربیع نے مجھ سے اپنے باپ کے حوالے سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ اس کا باپ سبرہؓ (فتح مکہ کے دن) حضورؐ کے ساتھ تھا ، جب کہ حضورؐ نے یہ اعلان عام فرمادیا کہ لوگو! میں نے تو تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی ، مگر اللہ نے اس کو قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا ۔ لہٰذا جس شخص کے پاس متعہ والی عورتوں میں سے کوئی عورت ہو تو اُسے رخصت کردے ۔

حدیث ۳ ، عن علیؓ انہ قال لابن عباسؓ ان النبی صلعم نهى عن المتعۃ وعن لحوم الحمر الاهلیۃ زمن خيبر ، بخاری ج ۲ ص۶۷) ورواہ مسلمؒ ، والدارقطنی واحمد ، وسعيد بن منصور مع اختلاف فی اللفظ فتح الباری ج ۹ ص۱۳۷

بخاریؒ حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ (تم متعہ میں نرمی سے کام لیتے ہو) حالانکہ حضورؐ نے متعہ سے اور گھروں میں پالے گئے گدھوں کے گوشت سے خیبر کے دن منع فرمادیا ہے ، امام مسلم ، دارقطنی ، امام احمد ۔

لوگ لے کر اطراف عالم میں منتشر ہو گئے ہیں۔ اور اس پر بڑی باتیں ہونے لگی ہیں تو انھوں نے کہا خدا کی قسم میں نے اس (اباحت مطلقہ) کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ یہ تو ایک مردار کی طرح ہے جو بجز اسے مضطر کے اور کسی کے لیے حلال نہیں ہے۔

بیہقیؒ اور خطابی کی یہ روایتیں فتح الباری میں مذکور ہیں۔

حدیث ۵ ، عن ابن ابی عمرة الانصاری انها كانت رخصة فی اول الاسلام لمن اضطر الیها کالمیتة والدم ولحم الخنزیر ثم احکم الله الدین ونهی عنها (مسلمؒ)

ابن ابی عمرہؓ فرماتے ہیں کہ متعہ بالکل مردار، خون خنزیر کی مانند ہے۔ ابتداء اسلام میں اس کی اجازت صرف ان لوگوں کے لیے تھی جو شدید حالتِ اضطرار میں مبتلا ہوں۔ اس کے بعد اللہ نے اپنا دین مضبوط بنا دیا۔ اور متعہ کرنے سے ممانعت فرمائی

حدیث ۶ ، قال ابن شهاب اخبرنی عروة بن الزبیر ان عبد الله بن الزبیر قام بمكة فقال ان ناسا اعمى الله قلوبهم كما اعمى ابصارهم یفتون بالمتعة یعرض برجل (یعنی ابن عباس) فناداه فقال انك لجلف جاف فلعمری لقد كانت المتعة تفعل فی عهد امام المتقین یرید به رسول الله صلعم فقال له ابن الزبیر فجرب بنفسك فوالله لئن فعلتها لارجمنك باحجارك ، (مسلم)

ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے عروہ ابن زبیر نے یہ خبر دی ہے کہ عبد اللہ بن زبیر نے مکہ میں قیام کیا۔ ایک دن کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ میاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو متعہ کے جواز کے فتوے دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں جن کے دلوں سے خدا نے روشنی سلب کر لی ہے جیسے ان کی آنکھوں سے ظاہری بینائی سلب کر لی ہے۔ عروہ کہتے ہیں کہ اس سے ابن عباسؓ پر تعریض کرنی مقصود تھی۔ ابن عباسؓ نے اُسے آواز دے کر کہا کہ تم بڑے سخت مزاج اور کم فہم آدمی ہو۔ میں اپنی بقاء کی قسم کھا کے کہتا ہوں

کہ یہ متعہ آنحضرت صلعم کے مبارک دور میں کیا جاتا
تھا جو تمام دنیا کے متقیوں کے امام اور پیشوا ہیں
اس پر ابن زبیر نے کہا کہ اچھا تم اسے آزما کر دیکھو
خدا کی قسم اگر تم نے متعہ کیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا

حدیث ۷ ، عن ابن عباس رض انه قال انما
كانت المتعة في اول الاسلام ، كان
الرجل يقدم البلد ليس له بها معرفة
فيتزوج امرأة بقدر ما يرى انه يقيم
فتحفظ له متاعه وتصلح له شانه حتى
اذا نزلت الآية الا على ازواجهم او ما
ملكت ايمانهم ، قال ابن عباس فكل
فرج سواهما فهو حرام (ترمذی رح)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ متعہ ابتداء اسلام میں ایسی
حالات میں جائز تھا جب کسی شخص کو ایسے شہر
یا گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوتا جہاں اس کو کسی سے
بھی جان پہچان نہ ہوتی۔ اس لیے مجبوراً مدت قیام تک
وہاں کسی عورت سے نکاح کرتا۔ اور وہ عورت،
اس کے لیے سامان کی حفاظت بھی کرتی اور دیگر
معاملات اور حالات کی اصلاح بھی یہاں تک
کہ جب یہ آیت نازل ہوئی الا علی ازواجہم او ما
ملکت ایمانہم، تو ابن عباس نے فرمایا، ہر عورت
جو بیوی، اور لونڈی کے علاوہ ہو، وہ حرام ہے"

روایات کا ماحصل روایات سے حسب ذیل تین امور ثابت ہوتے ہیں، جو بغرض تمہید الی الجواب ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ متعہ عہد نبوی کی ابتداء میں مباح، اور بعد میں حرام قرار دیا گیا ہے۔
اس دعوے کے ثبوت کے لیے دلائل وہ روایات ہیں، جو مذکورہ بالا فہرست احادیث میں ۱، ۲ و ۳ کے تحت گذر چکی ہیں۔

۲۔ متعہ کی ابتدائی رخصت صرف حالت اضطرار کے لیے تھی۔ عام حالات میں متعہ شرعاً کبھی بھی جائز نہیں سمجھا گیا ہے۔

اس رائے پر "کہ امام مالک خود متعہ کے جواز کے قائل تھے" تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

قلت لم یذکر فی کتب المالکیۃ انہا تجوز مع ان مالکا روی فی الموطاء حدیث علیؓ ان رسول اللہ صلعم نھی عن متعۃ النساء یوم خیبر، وعادتہ ان لا یروی حدیثا فی الموطاء الا وھو یذھب الیہ ویعمل بہ اھ نہایہ برحاشیہ ہدایہ ج ۲ ص ۲۹۲

میں کہتا ہوں کہ اوّل تو کتب مالکیہ میں جواز متعہ کا ذکر ہی نہیں ملتا ہے۔ دوسرا امام مالکؒ نے اپنے موطاء میں حضرت علیؓ کی وہ روایت بھی درج کی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے دن متعہ کرنے سے ممانعت فرمائی ہے، اور امام مالکؒ کی عادت یہ ہے کہ جس حدیث کو وہ موطاء میں ذکر کرتے ہیں وہ ان کا مذہب اور اس پر ان کا عمل ہوتا ہے۔

بہر حال یہ ایک متفقہ فیصلہ ہے اہل سنت کے مابین کہ متعہ حرام ہے۔ علماء امت کی تصریحات سے اس اجماع کی مزید تشریح اور اس کا ثبوت سوال کے ۱۲ کے جواب میں آئے گا، جہاں ابن عباسؓ کے رجوع پر بحث کی جائے گی۔

حرمت کے دلائل رہا یہ کہ حرمت متعہ کے دلائل کیا ہیں؟ تو اس بارے میں سلفؒ کی دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ صحابہؓ میں سے صرف حضرت عائشہؓ اور تابعین میں سے قاسم بن محمدؒ، جو حضرت عائشہؓ کے بھتیجے ہیں۔ ان دونوں کی رائے یہ ہے کہ یہ حرمت سورۂ مومنین کی آیت کریمہ فمن ابتغی وراء ذلک سے ثابت ہے۔ حسب ذیل روایات سے حضرت عائشہؓ اور قاسمؒ بن محمد کی رائے واضح ہے۔

۱۔ روی عن ابن ابی ملیکۃ ان عائشۃ سئلت عن المتعۃ، فقالت بینی، وبینھم القرآن، ثم قرأت الآیۃ، قالت فمن ابتغی غیر ما زوجہ اللہ او ملکہ یمینہ فقد عدا اھ کمالین، وروی مثلہ ابن المنذر وابن ابی حاتم والحاکم وصححہ عن عائشۃ ا۔

ابن ابی ملیکہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا، کہ میرے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کن قانون اللہ کی کتاب قرآن ہے پھر انھوں نے سورۂ مومنین کی آیت پڑھی اور فرمانے لگیں کہ جس شخص نے اپنی اس بیوی کے سوا جو خدا نے اس کے نکاح میں دے دی ہے [illegible]

روح المعانی ج ۵ ص ۵

لونڈی کے سوا کسی دوسری عورت کی تلاش کی۔ تو اس نے (شرعی حد سے) تجاوز کرلیا، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے بھی حضرت عائشہؓ سے صحیح سند وں سے یہی روایت کی ہے،

یہ وہ روایات ہیں جن سے حرمت متعہ کے مأخذ کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا نقطہ نظر واضح ہوجاتا ہے۔

ذیل میں وہ روایات ذکر کی جاتی ہیں جن سے قاسم بن محمد کی رائے معلوم کی جاسکتی ہے۔ وہ روایات یہ ہیں۔

۲ اخرج عبدالرزاق وابوداؤد فی ناسخه عن القاسم بن محمد انه سئل عن المتعة فقال هی محرمة فی کتاب الله تعالیٰ وتلا قوله تعالیٰ والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او ما ملکت ایمانهم۔ الآیة وتقرر وجه دلالة الآیة علی ذلک ان المستمتع بها لیست ملک الیمین ولا زوجة له فحینئذ ان لا تحل له اما انها لیست ملک الیمین فظاهر واما انها لیست زوجة له فلانهم لا یتوارثان بالاجماع ولو کانت زوجة له لحصل التوارث لقوله تعالیٰ ولکم نصف ما ترک ازواجکم الآیة

روح المعانی ج ۵ ص ۸، کبیر ج ۲ ص ۱۸۳

ابوداؤد نے اپنی کتاب "ناسخ" میں اور عبدالرزاق نے قاسم بن محمد سے یہ روایت کی ہے کہ اس سے متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ متعہ کتاب اللہ کی رو سے حرام ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کی۔ والذین هم لفروجهم الآیة اور حرمت پر آیت کے دلالت کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ممنوعہ عورت نہ تو بیوی ہے نہ لونڈی۔ لہذا متعہ کرنے والے کے لیے کسی طرح حلال نہ ہوگی لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے ہیں۔ حالانکہ بیوی ہونے کی صورت میں توارث قانون شرعی کی رو سے ضروری ہے"

اس روایت سے قاسمؒ بن محمد کا نقطہ نظر واضح ہوجاتا ہے۔

وھو قول ھذین الیومین فتکون نقد حرمت ثلث مرات ولم أر احد اصرح بذلك اھ

باقی آیت کے متعلق تو یہ طے شدہ ہے کہ وہ بالاتفاق مکی ہے۔ پس حضرت عائشہؓ، اور قاسم بن محمد کی رائے کے مطابق اگر آیت کو ثبوت حرمت کے لیے دلیل تسلیم کرلیا جائے تو مکی دور میں نزول آیت کے وقت میں بھی متعہ کی حرمت کو تسلیم کرنا پڑے گی جس سے تین دفعہ نسخ اور تحریم لازم آئے گی حالانکہ اس کی تصریح کسی عالم کے قول میں نہیں پائی گئی ہے۔"

مذکورہ بالا بحث کے بعد دونوں گروہوں کا مسلک ہمارے سامنے واضح ہوگیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ موخرالذکر مسلک کے حق میں دلائلِ ترجیح کیا ہیں۔ یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک اشکال کو رفع کرلیا جائے جو ترجیح کی توجیہ پر وارد کیا جاسکتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ آیت میں "وراء ذلك" کے الفاظ اپنے عموم کے لحاظ سے جس طرح تمام صور زنا کو شامل ہیں اسی طرح متعہ بھی اس کے عموم سے خارج نہیں ہے کیونکہ ممنوعہ عورت بھی نہ بیوی ہے نہ لونڈی، جیسا کہ مزنیہ عورت نہ بیوی ہے نہ لونڈی۔ تو آخر متعہ کو آیت کے عموم سے بلا دلیل کیوں خارج کیا جاتا ہے اور زنا کی طرح داخل نہیں مانا جاتا ہے؟ حالانکہ علماء اصول فقہ کے ہاں یہ مسلمہ اصول ہے کہ لفظ عام کے تمام افراد عام کے حکم میں داخل ہوں گے۔ اور کوئی فرد اس کے حکم سے بلا دلیل خارج نہیں کیا جاسکے گا۔

اس اشکال کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ عام کے حکم سے کوئی فرد بلا دلیل تو خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر دلیل سے بعض افراد عام کے حکم سے خارج کردئے جائیں تو یہ جائز بالاتفاق ہے مذاہب اربعہ کے ائمہؒ سب اس پہ متفق ہیں اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں ومذھب الائمة الاربع جواز تخصیص عموم القرآن بالسنة مطلقا وھو المختار اھ روح المعانی ج ۱۸ ص ۹ کسی آیت قرآنی کے عموم سے بعض افراد کی تخصیص سنت کے ذریعہ مذاہب اربعہ کے ائمہ کے

الآیۃ۔ البقرۃ ۔ رکوع ۲۹ اور دس دن ۔

اس آیت میں "ازواج" کا لفظ عام ہے ۔ اولات الاحمال اور غیر سب کو شامل ہے ۔ تو اس آیت کی رو سے اولات الاحمال کی عدت الوفات بھی دیگر عورتوں کی طرح چار ماہ اور دس دن ہونا چاہیے تھا لیکن آیت "واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن" (حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل کو وضع کریں) کے ذریعہ ازواج کے عموم سے اولات الاحمال کو خارج کر دیا گیا ہے ، اور ان کی عدت الوفات وضع حمل ہے نہ کہ چار مہینے اور دس دن ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس پر اس قدر یقین ظاہر کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں اس پر مباہلہ کا چیلنج کیا تھا' یہ دونوں مثالیں صدر الشریعۃ کی کتاب توضیح میں "حکم العام" کی بحث میں مذکور ہیں ۔ وہاں دیکھنا چاہیے ۔

تخصیص الکتاب بالسنہ کی مثال | آیت قرآنی کے عموم سے بعض افراد کا اخراج جس طرح کتاب کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے اسی طرح سنت کے ذریعہ سے بھی ہو سکتا ہے اور اوپر روح المعانی کے حوالہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ مسئلہ ائمہ اربعہؒ کے نزدیک متفق علیہ ہے ۔ اس کے لیے بھی شریعت میں بہت سی مثالیں موجود ہیں مگر یہاں ان میں سے صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

قرآن کریم میں محرمات کی فہرست میں ایک 'میتۃ' دوسرا 'دم' بھی ذکر کیے گئے ہیں ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے حرمت علیکم المیتۃ والدم الآیۃ تمہارے لیے مردار اور خون حلال نہیں بلکہ تم پر یہ دونوں حرام کئے گئے ہیں ۔ اس آیت میں المیتۃ اور الدم کے الفاظ عام ہیں ۔ میتۃ میں مچھلی وغیرہ مردار سب داخل ہیں اور الدم میں جگر تلی ، وغیرہ خون سب شامل ہے ۔ تو آیت کی رو سے یہ سب چیزیں حرام ہونی چاہئیں تھیں لیکن سنت اور حدیث نے میتۃ کے عموم سے مچھلی کو اور الدم کے عموم سے جگر کو خارج کر دیا ہے اور دونوں کے لیے حکم یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حلال ہیں نہ کہ حرام ـــــ الحاصل مذکورہ بالا امثلہ سے یہ حقیقت واضح ہے کہ دلیل سے عام کے حکم سے بعض افراد کا اخراج جائز ہے ۔ خواہ وہ دلیل کتاب ہو یا سنت ۔ اور جو ناجائز ہے وہ تخصیص بلا دلیل ہے اور جب دلیل سے عام کے حکم سے بعض افراد کی تخصیص جائز ہو گئی ۔ تو فمن ابتغی وراء ذلک میں وراء ذلک کے عموم میں اگرچہ متعہ بھی داخل ہو سکتا ہے

اس تحقیق پر زیادہ سے زیادہ جو اشکال وارد کیا جا سکتا ہے، ایک تو یہ کہ تحقیق مذکور کی بناء پر متعہ کی حرمت سنت رسول اور احادیث سے ثابت ہوگی۔ نہ کہ کتاب اللہ سے۔ دوسرا یہ کہ ایک آیت کی تفسیر کے متعلق حضرت عائشہ اور قاسم بن محمد کی رائے کیوں رد کر دی گئی؟ ۔۔۔ ان دونوں اشکالوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلا اشکال تو دراصل کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ جو لوگ سنت رسول کو کتاب اللہ کی طرح مآخذ شریعت تسلیم کرتے ہیں، اُن کو ضرورت کیا پڑی ہے کہ ہر حکم شرعی کے ثبوت کے لیے دلیل کتاب اللہ ہی سے تلاش کرتے رہیں۔ حالانکہ ان کا ایمان یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں سے احکام شرع ثابت اور مستنبط ہو سکتے ہیں۔ ان کے عقائد مقام رسالت، اور منصب نبوت کے متعلق وہ نہیں ہیں، جو منکرین حدیث کے ہیں بلکہ وہ اس تصور کے حامل ہیں کہ الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ (الحدیث) ("میری امت! آگاہ ہو کہ مجھے قرآن کے ساتھ مثل قرآن (سنت وحدیث) بھی من جانب اللہ عطا کیا گیا ہے") اور اس پر ان کو ایمان اور یقین کامل حاصل ہے کہ سنت کے بغیر الٰہی نظام شریعت کبھی اپنے اصلی رنگ میں قائم نہیں ہو سکے گا اور نہ یہ نظام الٰہی سنت سے کبھی علیحدگی قبول کر سکے گا۔ اور نہ وہ اس تصور سے آشنا ہے۔

اسی طرح دوسرا اشکال بھی کوئی وزنی اشکال نہیں ہے۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تمام صحابہؓ و تابعین، جمہور فقہاء و محدثین کی رائے پر حضرت عائشہؓ اور ایک قاسم بن محمد کی رائے کو ترجیح دی جائے حالانکہ اس سے منکرین حدیث کے لیے سنت رسول کو رد کرنے اور صحیح احادیث کو غلط ظاہر کرنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور خواہ مخواہ قرآن اور حدیث کے مابین تعارض کی شکل پیدا ہوتی ہے۔

کیا حرمت اباحت میں تبدیل ہوئی اس بارے میں علماء امت میں اختلاف پایا جاتا ہے، قاضی عیاضؒ، امام مازریؒ کی رائے یہ ہے کہ متعہ کی حرمت میں نسخ نہیں ہوا ہے بلکہ اب از غزوۂ خیبر میں تحریم کا حکم دیا گیا تھا۔ جس سے سابق اباحت رفع ہو گئی تھی اس کے بعد دیگر مواضع میں نہی کا مقصد سابق حکم تحریم کی اشاعت اور مزید تشہیر تھی نہ کہ جدید تحریم۔ لیکن جمہور محدثین کی رائے میں حرمت و اباحت دونوں میں تکرار ہے۔ غزوۂ خیبر میں تحریم کے حکم سے سابق اباحت منسوخ ہو گئی اور فتح مکہ میں اباحت ہے

حکم سے وہ حرمت منسوخ ہوگئی، جو غزوۂ خیبر میں حکم تحریم سے ثابت ہوئی تھی۔ اس کے بعد فتح مکہ ہی کے موقعہ پر جو ابدی تحریم کا حکم دیا گیا اس سے وہ اباحت منسوخ ہوگئی جو مکہ میں چند دن کے لیے ثابت ہوگئی تھی اور متعہ ہمیشہ کے لیے تا قیامت حرام قرار دیا گیا۔ محدثینؒ نے آخری رائے پر اظہار اعتماد کر لیا ہے۔

قال الماوردی، فی الحاوی فی تعیین موضع تحریم المتعة وجهان، احدهما ان التحریم تکرر، لیکون اظهر وانتشر حتی یعلمه من لم یکن علمه، لانه قد یحضر فی بعض المواطن من لا یحضر فی غیرها، والثانی انها ابیحت مرارًا ولهذا قال فی المرة الاخیرة الی یوم القیامة، اشارة الی ان التحریم الماضی کان موذنا بان الاباحة تعقبه، بخلاف هذا فانه تحریم مؤبد لا تعقبه اباحة اصلا، وهذا الثانی هو المعتمد، ویرد الاول التصریح بالاذن فیها فی الموطن المتاخر من الموطن الذی وقع التصریح فیه بتحریمها کما فی غزوة خیبر ثم الفتح، وقال النووی الصواب ان تحریمها واباحتها وقعا مرتین فکانت مباحة قبل خیبر، ثم حرمت فیها ثم ابیحت عام الفتح ثم حرمت تحریما مؤبدًا ونقل غیره من الشافعی ان المتعة نسخت مرتین، (فتح الباری ج ۹ ص ۱۳۹)

امام ماوردیؒ نے اپنی کتاب، حاوی میں لکھا ہے کہ تحریم متعہ کے لیے محل کی تعیین میں محدثین کے دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ تحریم کے حکم میں تکرار صرف اس لیے ہوا تھا کہ حکم عام لوگوں پر واضح اور زیادہ مشہور ہو جائے تاکہ جو لوگ پہلے تحریم کے موقع پر حاضر نہیں تھے وہ بھی اس حکم سے باخبر ہو جائیں کیونکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک حکم کے موقع پر بعض لوگ حاضر نہیں رہتے ہیں۔ اور کسی دوسرے موقعہ پر وہ حاضر رہتے ہیں اس لیے ایسے مواقع میں تکرار حکم کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ جن لوگوں کو پہلے موقعہ پر علم حاصل نہیں ہوا ہے وہ اس دوسرے موقعہ پر علم حاصل کرسکیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ متعہ میں اباحت (و حرمت دونوں) مکرر ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے آخری دفعہ میں تحریم کے ساتھ "قیامت تک" کی قید لگا کر اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ سابق تحریم کے بعد اباحت آنے والی تھی۔ اور یہ آخری تحریم ابدی ہے اس کے بعد قیامت تک اباحت نہیں آئے گی۔ یہ دوسرا قول محدثین کے ہاں قابل اعتماد رہا ہے، اور پہلا قول

تو بلا وجہ ان روایتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے
(اس لیے بہتر یہی ہے کہ متعہ میں اباحت وحرمت
مکرر مان لیے جائیں) اور تکرار اباحت (وحرمت)
سے کوئی مانع نہیں ہے۔

ابن عباسؓ کا مسلک ابن عباسؓ کے قول کے متعلق دو چیزیں تحقیق طلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بہرحالت میں جواز متعہ کے قائل تھے یا یہ کہ صرف حالت اضطرار میں؟ دوسری یہ کہ وہ اپنے قول سے رجوع کر گئے ہیں یا کہ تا زیست اپنے فتوے جواز پر قائم رہے ہیں؟ جہاں تک امر اول کا تعلق ہے اس کے متعلق ابن عباسؓ سے دو قسم کی روایتیں مروی ہیں۔ ایک صحیح روایتیں ہیں۔ دوسری ضعیف، صحیح روایات میں صاف اس امر کی تصریح ملتی ہے کہ ابن عباس صرف حالت اضطرار میں جواز متعہ کے قائل تھے، نہ کہ عام حالات میں، اس کی تائید اُن روایات سے بھی ہوتی ہے، جو دوسرے صحابہؓ سے اس معاملے میں مروی ہیں، جن میں یہ تصریح آتی ہے کہ ابتداء اسلام میں متعہ صرف حالت اضطرار میں مباح تھا، اور عام حالات میں اس کی اجازت نہ تھی۔ دونوں قسم کی روایتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ عن ابی جمرۃ قال سمعت ابن عباس یسئل عن متعۃ النساء فرخص فقال له مولیٰ له انما ذلك فی الحال الشدید وفی النساء قلۃ او نحوہ، فقال ابن عباسؓ نعم، (بخاری ج ۲ ص ۷۶۷) وفی روایۃ البیہقی انما کانت یعنی المتعۃ رخصۃ فی اول الاسلام لمن اضطر الیہا، کالمیتۃ والدم ولحم الخنزیر واخرج الخطابی عن سعید بن جبیر قال قلت لابن عباس لقد سارت بفتیاك	ابوجمرہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس سے متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو میں نے سنا کہ ابن عباسؓ نے اس کی اجازت دے دی۔ اس پر ان سے ان کے ایک آزاد کردہ شدہ غلام نے پوچھا کہ یہ اجازت اس وقت ہوگی جب کہ عورتیں بہت کم اور حالات بہت سخت ہوں؟ تو آپ نے فرمایا جی ہاں! اسی طرح بیہقی کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ متعہ تو مردار، خون، اور خنزیر کے گوشت کی مانند ہے ابتدا اسلام میں اس کی اجازت صرف ان لوگوں کے لیے تھی جو شدید حالت اضطرار میں مبتلا کیے گئے تھے۔

الركبان يعني في المتعة فقال والله ما بهذا افتيت وانما هي كالميتة لا تحل الا للمضطر

فتح الباری ج ۹ ص ۱۴۳

اسی طرح خطابیؒ نے سعید بن جبیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے ابن عباس سے کہا کہ متعہ کے بارے میں بہت سی جماعتیں آپ کا فتویٰ اباحت لے کر ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی ہیں اور اس پر بڑی باتیں ہونے لگی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں نے تو اباحت مطلقہ کا فتوے نہیں دیا ہے (بلکہ یہ فتوے دیا ہے) کہ متعہ تو ایک مردار کی طرح ہے جو مضطر کے علاوہ کسی کے لیے حلال نہیں ہے "

یہ وہ صحیح روایات ہیں۔ جو خود ابن عباس سے مروی ہیں اور جن میں یہ تصریح ہے کہ ابن عباس صرف حالت اضطرار میں متعہ کے جواز کا قائل تھے نہ کہ عام حالات میں۔ ذیل میں دوسرے صحابہؓ سے یہ روایت نقل کی جاتی ہے جو مذکورہ بالا روایتوں کے لیے موید ہے۔

۲۔ عن ابن ابی عمرة الانصاری، انها كانت رخصة في اول الاسلام لمن اضطر اليها كالميتة والدم ولحم الخنزير ثم احكم الله الدين ونهى عنها۔ (مسلم)

ابن ابی عمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ متعہ کی اجازت ابتدائے اسلام میں صرف مضطر لوگوں کے لیے تھی جیسے مردار خون، خنزیر کا گوشت، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مضبوط بنا دیا اور متعہ سے ممانعت فرمائی "

یہ روایات احادیث کی فہرست میں ۴ و ۵ میں گذر چکی ہیں۔ اور تمام سے یہ امر واضح ہے کہ ابن عباسؓ یا دیگر صحابہؓ جو جواز متعہ کے قائل تھے وہ صرف حالت اضطرار میں قائل تھے نہ کہ عام حالات میں البتہ بعض ضعیف روایات ایسی ہیں جن سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابن عباس حالت اضطرار کے ماسوائے دوسری حالتوں میں بھی جواز کے قائل تھے۔ حسب ذیل روایت سے جس کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے یہ خیال ظاہر ہو سکتا ہے۔

عن ابن عباس انه قال انما كانت المتعة

ابن عباس فرماتے ہیں کہ متعہ ابتدائے اسلام میں ایسی

رسائل و مسائل

پانچ نمازیں اور پچاس نمازیں

سوال: منکرین حدیث اس حدیث معراج پر بہت سے تمسخر آمیز اعتراضات کرتے رہتے ہیں جس میں پہلے پچاس نمازوں اور پھر حضرت موسیٰؑ کے مشورے پر آخر کار پانچ نمازوں کے فرض کیے جانے کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے جب پچاس نمازیں فرض کیں تو کیا اس وقت اسے احساس نہ تھا کہ میں ایک ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں۔ کیا حضرت موسیٰؑ کے مشورے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست ہی پر اللہ میاں کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ کیا حضرت موسیٰ اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی (نعوذ باللہ) بڑھ کر ہمہ دان ہیں کہ جو بات حضرت موسیٰؑ کو بروقت سوجھ گئی وہ اللہ اور اس کے آخری نبیؐ کے حاشیۂ خیال میں بروقت نہ آسکی۔ کیا دین کے محکم احکام اللہ میاں اسی طرح متعین کرتے ہیں کہ پچاس سے شروع کرتے ہیں اور چھوٹ دے کر پانچ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ منکرین حدیث کے خیال میں یہ حدیث کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ ان کے نبی کی فضیلت ثابت ہو۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ نمازیں اگر ابتداءً پچاس فرض کی بھی گئی تھیں تب بھی پانچ کی تعیین کے بعد پھر پچاس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس سے بلاوجہ ذہن میں الجھن پیدا نہیں ہوتی اور کیا اس طرح کی احادیث غیر مسلموں کو اعتراضات کے مواقع فراہم نہیں کرتیں؟ لیکن مسلمان پھر بھی ان حدیثوں کو سینے سے چمٹائے پھر رہے ہیں۔

براہ کرم اس حدیث کی صحت پر روشنی ڈالیں اور اس کی تاویل و تشریح بھی کریں تاکہ منکرین حدیث کے اعتراضات رفع ہو جائیں۔

جواب: یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ اس حدیث سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ پانچ نمازیں تعداد کے

لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے پنج وقتہ نماز کو منکرین حدیث کی طرح وبالِ جان سمجھ کر اس کی تعداد اس کی ہیئت، اور اس کے مفہوم و معانی میں کتر بیونت اور ترمیم و تنسیخ کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس حدیث سے مسلمانوں کو یہ تصور دلانا مطلوب ہے کہ یہ تعداد کم سے کم رکھی گئی ہے جو درحقیقت پچاس کی قائم مقام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے ورنہ اگر پچاس نمازیں بھی فرض کر دی جاتیں تو بے جا نہ ہوتا۔

اگر ہم طلبِ ہدایت کا جذبہ لیے ہوئے اس حدیث کا مطالعہ کریں تو اس سے ہمیں وہی تعلیم ملتی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ لیکن اگر ہم اسے انکار، استخفاف اور استہزاء کی نیت سے دیکھیں تو اس حدیث کے پڑھنے سے وہ سارے اشکالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں جو آپ نے نقل کیے ہیں۔ اسی ایک حدیث پر کیا موقوف ہے اس کے علاوہ بے شمار دیگر احادیث بلکہ بے شمار آیات قرآنی پر اگر اسی طرح طبع آزمائی کی جائے تو ان پر اسی طرح کے بیسیوں اعتراضات وارد کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً جہاد کا حکم دیتے ہوئے سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (الانفال ۶۵)	اے نبی ابھارو مومنین کو قتال پر۔ اگر ہوں گے تم میں سے بیس ثابت قدم، غالب ہوں گے دو سو پر اور اگر ہوں گے تم میں سے سو غالب آئیں گے ہزار پر کافروں میں سے، کیونکہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں۔

اب اس جگہ صاف طور پر کافروں کے بالمقابل مسلمانوں کے غالب ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور کافروں کی ایک اور دس کی نسبت بیان فرمائی ہے، لیکن اس کے فوراً بعد دوسری آیت ہے:

الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ	اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی تم پر سے اور جان لیا کہ تم میں کمزوری ہے، پس اگر ہوں گے تم میں سے سو ثابت قدم، غالب آئیں گے دو سو پر اور اگر ہوں گے تم میں سے ہزار، غالب آئیں گے دو ہزار پر اللہ کے

راہ میں پس پڑھو جتنا آسان ہو اُس میں سے۔
یہاں بھی یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ احکام متعین کرنے کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ پہلے تو نصف شب یا اُس کے کم و بیش کے قریب قیام لیل کا حکم دیا اور پھر یہ کہا گیا کہ اللہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم یہ حکم بجا نہیں لا سکو گے اور یہ بات بھی اُس کے علم میں آ گئی ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے کچھ مسافر ہوں گے اور کچھ قتال فی سبیل اللہ کریں گے، اس لیے چلو اب ½، ⅓ یا ⅔ حصہ شب کی عبادت کی قید ختم کی جاتی ہے اور تمہیں چھوٹ دی جاتی ہے کہ بآسانی جتنا قرآن پڑھ سکو، پڑھ لو۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیا اللہ کو (نعوذ باللہ) بعد میں ہوش آیا کہ میں ایک ناممکن العمل حکم دے بیٹھا ہوں اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کیا اب اُس کے نوٹس میں یہ بات آئی ہے کہ ہم میں سے تو مریض، مسافر مقاتل بھی ہوں گے، اس لیے قیام لیل کی سابق مقدار مطلوب کو ایک زیادتی سمجھ کر اب اُس میں تبدیلی کی جا رہی ہے۔

اسی طرح مثلاً قرآن میں ایک جگہ یہ آیا ہے وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اور دوسری جگہ آیا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ یعنی ایک جگہ یہ کہا گیا کہ ہم نے موسیٰؑ سے چالیس دن طے کیے تھے اور دوسری جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تیس دن طے کیے تھے اور پھر دس سے ان کی تکمیل کی۔ ایک مریض القلب آدمی یہاں بھی یہ اعتراض جڑ سکتا ہے کہ آخر یہ کیسا انداز بیان ہے کہ ایک جگہ میعاد صاف طور پر چالیس دن بتائی گئی اور دوسری جگہ تیس دن بتائی گئی اور پھر اس میں دس بڑھا کر چالیس کی گنتی پوری کرنے کا تکلف کیا گیا۔

ان دو تین مثالوں سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نکتہ چینی اور نکتہ آفرینی کا شوق ہو تو حدیث تو درکنار قرآن کی ایک ایک آیت کے بارے میں اعتراضات کے انبار لگائے جا سکتے ہیں لیکن اگر آدمی نصیحت و عبرت اور ہدایت و تذکیر کا طالب ہو تو وہ ابتغائے فتنہ کا مشغلہ نہیں اختیار کرتا بلکہ اتباعِ احسن کی روش پر کاربند ہوتا ہے۔ جو حدیث اس وقت معرض بحث میں ہے اُس کے بارے میں بھی ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک نکتہ بیں نگاہ سے اس حدیث کو دیکھنے والا

پانچ اور پچاس ہی کی گنتی میں اُلجھ کر رہ جائے گا یا پھر اس طرح کی کج بحثیوں میں مبتلا ہو جائے گا کہ مشورہ دینے والے نبی، مشورہ لینے والے نبی اور مشورہ قبول کرنے والے خدا، ان تینوں میں سے زیادہ صاحب علم، معاملہ فہم اور حاضر دماغ کون ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر سے اگر اس حدیث پر غور کیا جائے تو انسان کو اس کے اندر دین کے ایک عظیم اصول یعنی اصول تخفیف و تیسیر کی ایک دلآویز تصویر نظر آتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو اس حقیقت کا تصور دلایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ حکم دے کہ ہم دن رات میں پچاس مرتبہ اس کی اطاعت کا عہد استوار کریں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں تو یہ ہرگز اللہ کی طرف سے "زیادتی" نہ ہوگی اور اس نے اپنے دو محبوب رسولوں کی درخواست اور سفارش پر اگر صرف پانچ مرتبہ ایسا کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب کوئی نئی حقیقت اس کے سامنے منکشف ہوئی ہے جس کا اسے پہلے "علم و احساس" نہ تھا۔ نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ اس طرح وہ اپنے فضل و انعام اور اپنی رحمت و مودت کا احساس اپنے بندوں کو دلانا چاہتا ہے اور اس تخفیف کا ذریعہ اس نے اپنے دو پیغمبروں کو اس لیے بنایا ہے تاکہ ان کی تکریم و تشریف ہو، ہمارے دلوں میں ان کی محبت جاگزیں ہو اور اللہ کے ہاں اس کے انبیاء کی جو قدر و منزلت ہے ہمیں اس کا اندازہ ہو۔ جب ہم اس نگاہ سے اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل اعتراض کے کانٹوں سے پاک اور اللہ کی حمد و ثنا سے لبریز ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے ضمن میں حضرت موسیٰ کی افضلیت اور کسی یہودی کے اس حدیث کو گھڑنے کا سوال بھی وہی شخص پیدا کر سکتا ہے جو خواہ مخواہ کی کور ذوقی، کج فہمی اور شقاق میں مبتلا ہو۔ قرآن و حدیث دونوں میں یہ حقیقت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ خدا کے رسول ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔ کسی کی شخصیت میں ایک وصف نمایاں ہے تو کسی دوسرے رسول میں کوئی اور خصوصیت نمایاں ہے۔ ہم ان کے انفرادی خصائص بیان کر سکتے ہیں مگر ہمارا بیان ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے کسی خاص نبی کی توہین و تحقیر کا پہلو نکلتا ہو۔ زیر بحث حدیث بھی انبیاء کے توہین آمیز تقابل یا تفاضل سے بالکل پاک ہے۔ اگر منکرین حدیث کے حسن استدلال کی داد دیتے ہوئے ہم یہ تسلیم کر لیں کہ مشورہ دینے والے کی افضلیت اور اس کے

ثواب و عذاب کا مشاہدہ کرایا گیا۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ خود اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ الٰہی میں خصوصی باریابی اور بار بار کی باریابی سے مشرف فرمایا گیا۔ اب ایک شخص کی کھوپڑی اگر الٹی ہو تو وہ ان تفصیلات کی ہر شق پر بیسیوں اعتراضات کر سکتا ہے۔ چنانچہ منکرینِ حدیث ان احادیث کو اکثر نشانۂ تضحیک بنائے رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ان احادیث سے قطع نظر کر کے اگر ہم واقعۂ معراج سے متعلق قرآنی آیات کو دیکھیں تو کیا ان آیات میں بھی ایسا "تشابہ" موجود نہیں ہے جس کی صحیح تاویل کو اللہ ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ کیا قرآن میں "اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جانے اور اپنی آیات دکھانے" کا ذکر نہیں ہے؟ کیا قرآن میں کسی کے "دو کمان یا اس سے قریب تر ہونے کا" ذکر نہیں ہے؟ کیا سوال کرنے والا یہاں یہ سوال نہیں کر سکتا کہ دو کمان سے کیا مراد ہے اور اگر فاصلہ دو ہی کمان تھا تو پھر اَوْ اَدْنٰی کہنے کا کیا قرینہ تھا۔ پھر قرآن میں جس "سدرۃ المنتہیٰ" کا ذکر ہے اس کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ وہی سِدرہ (بیری) کا معروف درخت ہے اور اگر وہی ہے تو پھر "پرلی بیری" سے کیا مراد ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جس نے اس بیری کو ڈھانپ رکھا تھا؟ کیا ان چیزوں پر غیر مسلموں کو اعتراض کرنے کا موقع پہلے یا آج کبھی نہیں ملا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ منکرینِ حدیث ان آیات کو اپنے سینوں سے چمٹائے پھر رہے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کرنے کے لیے چونکہ ابھی فضا پوری طرح سازگار نہیں ہے اس لیے سرِدست پہلا مورچہ حدیث کے بالمقابل جمایا جا رہا ہے؟

خالی صفحه

مخلوط انتخاب کے انتشار انگیز نعروں

نے پاکستان کی جد و جہد میں اپنی جان ' مال اور آبرو کی قربانی دینے والے لاکھوں مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا مسلمانوں کا تہذیب و تمدن دوسری تہذیبوں سے کوئی جداگانہ نوعیت نہیں رکھتا اور کیا پاکستان کے حصول کے لئے ساری قربانیاں بیکار نہیں تھیں - اگر مسلمانوں کے تصور زندگی اور غیر مسلموں کے تصور زندگی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور پاکستان میں بھی اسلام کو اجتماعی نظام کی حیثیت سے اس لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلم اسے پسند نہیں کرتے -

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نہایت تفصیل کے ساتھ اسلامی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے تمیز کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلامی تہذیب کے ماخذ دنیا کی دوسری تمام تہذیبوں سے قطعاً مختلف ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہ قائم کہا جا سکتا ہے اور نہ اختیار ہی کیا جا سکتا ہے جب تک کہ ان بنیادوں کو تسلیم نہ کیا جائے جن پر اسلامی تہذیب کی عمارت استوار کی گئی ہے - دیدہ زیب گرد پوش اور مضبوط جلد قیمت تین روپے آٹھ آنے -

---

تاریخ کا کوئی دور ہو

* پتھر کا زمانہ ہو یا ایٹم کا دور

اسلام

ہر دور میں ایک نہایت کامیاب اجتماعی نظام کی حیثیت سے چل سکتا ہے کیونکہ اس کے اصول انسانی فطرت کی بنیاد پر قائم ہیں اور الہامی ہدایت کی روشنی سے منور ہیں

تنقیحات

میں مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف علمی ' سیاسی ' معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں اتنی خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ حل کیا ہے کہ نہ صرف مختلف گتھیاں سلجھ گئی ہیں بلکہ اسلام کی انقلاب انگیز دعوت بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی ہے - خوبصورت گرد پوش اور مضبوط جلد - قیمت ساڑھے تین روپے -

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	شعبان ۱۳۷۵ھ مطابق اپریل ۱۹۵۶ء	جلد ۴۶

اشارات	نعیم صدیقی	۲
تفہیم القرآن:		
سورۃ النور (۷)	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۸
مقالات:		
محسنِ انسانیت	نعیم صدیقی	۳۲
مسئلہ متعہ	مولانا محمد یوسف	۴۳
رسائل ومسائل		
پانچ نمازیں اور پچاس نمازیں	ر۔ ع	۶۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

خـــالی صفحـــه